مطبوعات جدیدہ

رجال السند والہند (عربی) مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت طباعت عمدہ صفحات ۵۰۰، قیمت: درج نہیں پتہ، دارالانصار، دارالبستان نامیۃ شارع الجھویۃ عابدین قاہرہ

یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو بڑے حذف واضافہ کے بعد شایع کیا گیا ہے، اور دو جزوں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی ضخامت بھی دوچند ہو گئی ہے، پہلے جزء میں ہند وسند کے دو طرح کے اشخاص کا تذکرہ ہے، ایک وہ جو یہیں پیدا ہوئے اور مدۃ العمر یہیں رہے، دوسرے وہ جن کا اصل تعلق تو اسی سرزمین سے تھا، مگر ان کی ولادت وسکونت باہر رہی، دوسرے جزء میں باہر سے یہاں آکر واپس چلے جانے والوں یا باہر سے آکر یہیں قیام پذیر ہونے اور یہیں کی خاک کا پیوند ہونے والوں کا تذکرہ ہے، دونوں جزوں میں ساتویں صدی سے قبل کے مختلف طبقوں کے سینکڑوں مشاہیر کا ذکر ہے، پہلے جزء کے شروع میں ساتویں صدی سے پہلے کے عالم اسلام بشمول سندوہند کی مختصر مرقع آرائی کرکے دکھایا ہے کہ علمی، دینی، سیاسی اور تمدنی حیثیت سے یہ مسلمانوں کا عہد زریں تھا، نیز اس دور کے مشہور اور اہم شہروں کے متعلق بھی مختصر معلومات قلمبند کیے ہیں، دوسرے جزء کا آغاز ہندوستان میں آنے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مصنف کو یہ صراحت کر دینی چاہیے تھی کہ اکثر صحابۂ کرام غازی اور فوجی کی حیثیت سے یہاں تشریف لائے تھے، لیکن انھوں نے نہ تو اس کو اپنا مستقر بنایا اور نہ ان کی یہاں وفات ہوئی، دوسرے اس دور میں مکران وغیرہ بھی سندوہند ہی کا جزء سمجھے جاتے تھے اور اس زمانہ کے اکثر فاتحین وہیں آئے تھے، یہ کتاب رجال وانساب، طبقات وتراجم، تاریخ وجغرافیہ، فتوح ومغازی اور ادب ومحاضرات کی بیشمار کتابوں کی ورق گردانی کے بعد لکھی گئی ہے اور اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخ پر کام کرنیوالوں کو بڑی مدد ملے گی۔

"ض"

جلد ۱۲۹ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۲ء عدد ۳

مضامین

مقالات

عرب وہند کے تعلقات

شذرات

دارالمصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" پر جو بین الاقوامی سیمینار ہونے والا تھا وہ گذشتہ ماہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخیر و خوبی انجام پاگیا، اس کی کچھ روداد تو اس شمارہ میں ملے گی، بقیہ آیندہ اشاعت میں شایع ہوگی۔

الحمدللہ کہ یہ سیمینار محض ایک دلچسپ علمی نشست تک محدود نہیں رہا، بلکہ اپنے موضوع کی اہمیت کی وجہ سے ایک مستقل تحریک میں ابھرا، اس کو فروغ دینے کے لیے مختلف ممالک کی انیس مقتدر شخصیتوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی ہے، جو علمی و معیاری بنیاد پر مستشرقین کی غلطیوں کی توضیح و تصحیح کیلئے ایک تصنیفی و تالیفی پروگرام مرتب کرے گی اور اسکول کی سطح سے یونیورسٹیوں کے معیار کے مطابق ایسی کتابیں تیار کرنے میں مدد دے گی جن سے مسلمان نوجوانوں کے ذہن کی صحیح اور صالح تربیت ہو سکے، یہ اسلامی موضوعات پر حوالجات کی معیاری کتابیں تیار کرنے کی بھی سہولت فراہم کرے گی،

یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ دارالمصنفین نے اسلامی موضوعات پر جو گرانقدر کتابیں پیش کی ہیں، ان کو عربی اور آج کی زندہ زبانوں خصوصاً انگریزی میں منتقل کیا جائے، تاکہ ان سے بڑے پیمانہ پر استفادہ کیا جا سکے اور اس طرح اس مذاکرہ علمی کے مقاصد پورے ہوں، یہ بھی طے پایا کہ دارالمصنفین میں ایک سکریٹریٹ قائم کیا جائے جو سیمینار کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنائے، اور مذکورۂ بالا کمیٹی سے رابطہ قائم رکھے، اس کی نظامت اس خاکسار کے سپرد کی گئی اور یہ اختیار دیا گیا ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مشورہ سے دفتر رابطہ کی ضروریات کے لیے مناسب اسٹاف مقرر کیا جائے۔

سیمینار میں یہ اعتراف کیا گیا کہ بعض مستشرقین نے مفید کام ضرور انجام دیے ہیں، لیکن ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جنھوں نے اپنی پُرفریب تحریر و تحقیق سے فتنہ پروری اور شر انگیزی کی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود مسلمان اہل قلم اور ارباب فکر نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے ایسا اسلامی لٹریچر پیش نہیں کیا جس کی تلاش مسلمان نوجوانوں کو خاص طور پر تھی اس خلا سے

مستشرقین نے پورا فائدہ اٹھایا، اب ضرورت اس کی ہے کہ یہ خلا جلد از جلد پر کیا جائے، اس سیمینار سے جو خوشگوار فضا پیدا ہوئی ہے اس سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہو گئی ہیں۔

مستشرقین کے خلاف ہماری جنگ اب تک مدافعانہ رہی، اب اس میں کچھ جارحانہ رنگ بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے، یہ مستشرقین زیادہ تر خاکم بدہن ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ پر یہ سمجھ کر حملے کرتے ہیں کہ ہم ان کے رسولؑ پر ناروا حملے نہیں کر سکتے، کیونکہ اس سے ہمارے ایمان میں خلل پڑ جائے گا، یہ صحیح ہے کہ ہم ان کے رسولؑ کی ذات مبارک کے خلاف تو کچھ نہیں لکھ سکتے لیکن ان کے موجودہ تحریف شدہ مذہب پر ہمارا قلم خوب چل سکتا ہے،

توحید اور رسالت سے متعلق موجودہ عیسائیوں کا کیا تصور ہے؟ ان کا عقیدۂ تثلیث کہاں تک صحیح ہے؟ باپ، بیٹے اور روح القدس میں ہر ایک کو خدا مان لیا جائے تو کیا خدا ایک رہا یا تین؟ کیا حلول و تجسم کا عقیدہ حضرت عیسیٰؑ کی عین تعلیم کے مطابق ہے؟ کیا حضرت عیسیٰؑ کو پنطیس پیلاطیس کے حکم سے واقعی سولی پر چڑھایا گیا؟ کیا حضرت عیسیٰؑ پھانسی پانے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد پھر زندہ ہو گئے، صلیب مقدس کا نشان حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد ہی شروع ہوا یا تین صدیوں کے بعد شاہ قسطنطین کا اختراع ہے؟ مصلوبیت، بپتسمہ، حیات ثانیہ اور کفارہ کی نوعیت کیا ہے؟ عشائے ربانی میں روٹی کے ساتھ جو شراب پی جاتی ہے کیا وہ واقعی حضرت عیسیٰؑ کے بدن کا خون بن جاتا ہے؟ عیسائیت کا بانی کون ہے؟ حضرت عیسیٰؑ یا پولس، کیا حضرت عیسیٰؑ اور پولس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں؟ کیا پولس نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں تحریف نہیں کی؟

حضرت عیسیٰؑ کے حواری ان کو کیا سمجھتے تھے اور اب کیا سمجھے جاتے ہیں؟ انجیل یوحنا کی کیا حقیقت ہے؟ کیا یوحنا حضرت عیسیٰؑ کے شاگرد تھے، کیا یہ یوحنا انجیل کسی یہودی عالم نے نہیں لکھی، کیا انجیل یوحنا جعلی تصنیف ہے؟ یا ایک الہامی کتاب ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ حضرت مسیحؑ کے بعد سنہ ۹۵ء تک اس کا ذکر کہیں نہیں آتا؟ کیا حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں کے مستند حالات کبھی لکھے گئے یا ان میں افسانوی رنگ پیدا کر دیا گیا ہے؟ کیا دوسری اور تیسری انجیل یعنی مرقس اور لوقا حواریوں کی ہیں؟ بائبل میں عہد عتیق اور عہد جدید کی تفریق کیوں

کی گئی؟ کیا بائبل اپنی تحریفات کے باوجود معنوی اختلافات کا مجموعہ نہیں؟

کیا کلیسا اور پاپائیت کی تاریخ داغدار نہیں؟ کیا مشہور پاپائے اعظم سینٹ گری گوری کا زیادہ تر وقت ملکہ برونہاٹ کی خوشامد میں نہیں گذرتا تھا؟ شاہ گونڈی بالڈ نے اپنے بیٹوں کو قتل کر ڈالا تو کیا پادری سینٹ اوڈیس نے اس قتل کو صحیح ثابت کرکے اس کی حکومت کی جڑ کو مضبوط نہیں کیا؟ کیا کلیسا کے اندر مے نوشی اور عیش پرستی نہیں ہوتی؟ کیا یہ پادری اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کرتے رہے؟ کیا یہ پادری اپنی تجرد پسندی کے باوجود خاموشی سے ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ لیتے تھے؟ کیا سینٹ اگسٹائن تعدد ازدواج کو بداخلاقی اور معصیت یا ناجائز سمجھتا رہا؟ کیا جرمنی کے مذہبی مصلحین سولھویں صدی تک تعدد ازدواج کے قائل نہیں رہے؟ کیا فرانس کے میرووِنجین بادشاہوں کے محل میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رہیں؟ کیا فریڈرک باربروسہ اور فلپ تھیوڈوٹس کی کئی بیویاں نہیں تھیں؟ کیا شارلیمین نو بیویوں کا شوہر نہیں تھا؟

تعدد ازدواج کے عیسائی مخالفین کے معاشرہ میں جو آج صنفی آوارگی، بیسوائی، نیم عریانی، نائٹ کلب، برہنہ رقص، منع حمل، اسقاط، طلاق، ناجائز ولادتوں کی کثرت ہے اور ستم بالائے ستم مرد کی مرد اور عورت سے عورت کی شادی کا جو قانونی جواز ہے، کیا ان سے انسانیت کی گردنیں فخر سے اونچی یا شرم سے جھکی ہوئی ہیں؟

کیا عیسائی حکمرانوں نے اپنی لڑائیوں میں اتنا خون نہیں بہایا جو دنیا کے تمام ذبح خانوں میں اب تک نہ بہا ہوگا؟ کیا ولیم اول نے انگلستان فتح کیا تو اس کے حکم سے ایک لاکھ سے زیادہ مردوں، بچوں اور عورتوں کو ہلاک نہیں کیا گیا؟ کیا پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی ۳۰ سالہ جنگ میں بوہیمیا کے پینتیس ہزار گاؤں برباد نہیں کیے گئے؟ کیا ۱۹۵۱ء میں پوپ کے حکم سے نیدرلینڈ کے تیس لاکھ باشندے سولی پر نہیں چڑھائے گئے؟ کیا یہ کہنا غلط ہے کہ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں ایک کروڑ آدمی میدان جنگ میں مارے گئے؟ کیا دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم سے ہیروشیما میں لاکھوں مرد، عورت، بچے اور بوڑھے تڑپتے ہوئے دکھائی نہیں دیے؟ کیا ویٹ نام کی لڑائیوں میں امریکیوں نے اٹھارہ لاکھ نوے ہزار چھ سو اڑسٹھ حملے کرکے وہاں کے پینتیس لاکھ ساٹھ ہزار آدمیوں کو لقمۂ اجل نہیں بنایا؟

یہ سارے موضوعات ایسے ہیں کہ اگر مستشرقانہ انداز میں ان کا معروضی اور محققانہ مطالعہ کیا جائے تو ان کے لکھنے والے ان مستشرقین کے محاذ پر پہنچ کر ان کے خلاف آسانی سے صف آرا ہو سکتے ہیں۔

مقالات

جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۷)

تاریخ اسلام جلد دوم

شاہ صاحب کی تاریخ اسلام کی دوسری جلد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی، اس میں امیر معاویہؓ، یزید اور عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق وہی واقعات ہیں جو وہ سیر الصحابہ جلد ششم میں لکھ چکے تھے، مگر اس جلد میں تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ان سارے واقعات کو دہرانا بھی ضروری تھا، اور انھوں نے ان کو دہرایا بھی، مگر ان کی ترتیب اور نظم کچھ ایسا رکھا کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سیر الصحابہ جلد ششم کی ہو بہو نقل ہے، یہ ان کی تصنیفی خوش سلیقگی کے ساتھ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ان کے قلم میں اتنی قوت آگئی تھی کہ واقعات کے دہرانے میں دوسرا انداز بھی اختیار کر سکتے ہیں، بنی امیہ میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پر مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ایک مستقل کتاب شائع ہو چکی تھی، پھر وہ خود اپنی کتاب تابعین میں ان پر سیر حاصل بحث کر چکے تھے، اس لیے اس میں کچھ مزید اضافہ کرنا ممکن نہ تھا، انھوں نے اپنی اس جلد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حالات قلمبند کرنے میں اس کا پورا خیال رکھا ہے کہ ان کی تحریر اور انداز بیان مولانا عبدالسلام ندوی کی سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مختلف ہو، اور پھر تابعین میں جو کچھ لکھ چکے ہیں اسی کو نقل نہ کر دیں، اور اس میں وہ کامیاب رہے،

اس جلد میں امیر معاویہؓ، یزید اور عبداللہ بن زبیرؓ کے علاوہ معاویہ ثانی بن یزید، مروان بن حکم، عبدالملک بن مروان، ولید اول بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ، یزید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک وغیرہ کے حالات ہیں۔

اس خاندان کی حکومت ۴۱ھ/۶۶۱ء میں شروع ہوئی اور ۱۳۲ھ/۷۴۹ء میں ختم ہوگئی، یعنی کل اٹھاسی برس رہی، اس دور میں امیر معاویہؓ کے زمانہ میں شیعان علی، شیعان بنی امیہ اور خوارج کی شورش رہی، یزید کے عہد میں تو کربلا کا عبرت انگیز خونیں واقعہ ہی پیش آیا، عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں توابین، مختار بن ابی عبید ثقفی، محمد بن حنفیہ، عبیداللہ بن الحر جعفی، عمرو بن سعید، مصعب بن زبیر، عبداللہ بن زبیرؓ کے ہنگامے پیش آئے، جن میں مختار ثقفی، عمرو بن سعید اموی، مصعب بن زبیر قتل کیے گئے اور عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوئے، سلیمان بن عبدالملک (۹۶-۹۹ھ / ۷۱۵-۷۱۷ء) کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کے چار عظیم ہیرو قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر، عبدالعزیز بن موسیٰ کا عبرتناک انجام ہوا، ہشام بن عبدالملک (۱۰۵-۱۲۵ھ) کی حکومت میں زید بن علی ایک جنگ میں ہلاک ہوئے، اسی طرح ولید بن ثانی بن یزید بن عبدالملک کے دور میں یحییٰ بن زید قتل کیے گئے، مروان ثانی بن محمد بن مروان (۱۲۷ھ-۷۴۵ء) کی حکومت میں امام ابراہیم کا قتل ہوا، پھر بغاوتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، امیر معاویہؓ کے زمانہ میں حجر بن عدیؓ جیسے بڑے صحابی قتل کیے گئے، عبدالملک بن مروان کے خلاف عراق میں اشعث کی بغاوت ہوئی جس میں وہ مارا گیا، ولید بن عبدالملک کے عہد میں اشبیلیہ میں بغاوت ہوئی، سلیمان بن عبدالملک نے قتیبہ بن مسلم پر بغاوت کا الزام رکھ کر اس کو قتل کیا، یزید ثالث کی حکومت میں حمص، فلسطین اور اردن میں بغاوتیں ہوئیں، مروان ثانی کے عہد میں شام میں سرکشی ہوئی، خلیفہ ولید ثانی بن یزید (۱۲۵-۱۲۶ھ / ۷۴۳ء) کی اتنی مخالفت ہوئی کہ اس کا قتل ہوا، خارجیوں کی شورش تو ہر زمانہ میں ہوئی، شاہ صاحب نے بنی امیہ کی تاریخ کے ان تاریک پہلوؤں کو اچھی طرح دکھایا ہے، ایک دیانتدار مورخ کا فرض ہے کہ وہ تاریخ لکھنے میں تاریک پہلوؤں پر پردہ نہ ڈالے، لیکن شاہ صاحبؒ نے

بنی امیہ کی تاریخ کے روشن پہلوؤں کو بھی اچھی طرح واضح کیا ہے، جس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شورشیں اور بغاوتیں بھی ہوتی رہیں، لیکن اس کے ساتھ فتوحات اور حکومت کی ترقیاں بھی جاری رہیں، امیر معاویہؓ کے زمانہ میں سندھ، ترکستان، شمالی افریقہ، روڈس، ارواڈ وغیرہ کی فتوحات ہوئیں، ولید بن عبدالملک کے فوجی سرداروں نے ترکستان اور چین کے علاقے فتح کیے، خاقان چین بھی اطاعت گذار ہوا، سمرقند بھی فتح ہوا، محمد بن قاسم نے سندھ کو زیرنگیں کیا، اسی زمانہ میں طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے جس طرح اندلس پہونچ کر قرطبہ، تدمر، طلیطلہ، مدینۃ المائدہ، قرمونہ، اشبیلیہ اور ماردہ وغیرہ کو فتح کیا ہے اس کو شاہ صاحبؒ نے بہت ہی ولولہ انگیز طریقہ پر قلمبند کیا ہے، طارق بن زیاد نے وادی لکہ میں دریا کے کنارے پہونچ کر اپنی ایک تقریر سے اپنے لشکریوں کی جس طرح ہمت بڑھائی ہے، وہ شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں سنیے:

"امابعد، لوگو! میدانِ جنگ سے مفر کی اب کوئی صورت نہیں ہے، آگے دشمن ہے اور پیچھے دریا، خدا کی قسم پامردی اور استقلال میں نجات ہے یہی وہ فتحمند فوجیں ہیں جو مغلوب نہیں ہوسکتیں، اگر یہ دونوں باتیں موجود ہیں تو تعداد کی قلت سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا، بزدلی، کاہلی، سستی، نامردی، اختلاف اور غرور کے ساتھ تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتی۔

لوگو! میری تقلید کرو، اگر میں حملہ کروں تو تم بھی حملہ آور ہو جاؤ اور جب میں رک جاؤں تو تم بھی رک جاؤ، جنگ کے وقت سب مل کر ایک جسم بن جاؤ، میں اس سرکش یعنی ماڈرک پر حملہ کرکے دست بدست مقابلہ کروں گا، اگر میں اس حملہ میں مارا جاؤں تو تم رنج و غم نہ کرنا اور میرے بعد آپس میں جھگڑ کر لڑنہ بیٹھنا، اس سے تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی اور تم دشمن کے مقابلہ میں پیٹھ پھیر دوگے اور قتل و گرفتار ہوکر برباد ہوجاؤگے، خبردار! وقت پر راضی نہ ہونا اور اپنے کو دشمن کے حوالہ نہ کرنا، خدا نے مشقت اور جفاکشی کے ذریعہ دنیا میں تمہارے لیے جو عزت، شرف، راحت اور آخرت میں شہادت کا جو ثواب مقدر کیا ہے اس کی طرف بڑھو، خدا کی پناہ اور حمایت کے باوجود اگر تم ذلت پر راضی ہوگئے تو

تمہارے گھاٹے میں رہو گے، دوسرے مسلمان الگ تم کو برے الفاظ سے یاد کریں گے، جیسے ہی میں حملہ کروں تم بھی حملہ آور ہو جاؤ۔"

شاہ صاحب ایک یورپین مورخ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اسپین کی فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد ہی عربوں نے ترقی شروع کر دی، ایک صدی کے اندر اندر غیر مزروعہ زمینیں کاشت ہونے لگیں، اجاڑ بستیاں آباد ہو گئیں، بڑی بڑی عمارتیں بن گئیں، دوسری اقوام سے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے، اس کے بعد ہی عربوں نے علوم و ادب کی طرف توجہ کی، یونانی اور لاطینی کتابوں کے ترجمے کرائے، دار العلوم قائم کیے جو مدت تک یورپ میں علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔

شمالی اندلس کی فتح کے بعد مسلمان فرانس کی طرف بڑھے، مگر وہ پھر پیچھے پلٹ آئے، اسی زمانہ میں ولید نے اپنے بھائی مسلمہ اور اپنے لڑکے عباس کو شام بھیجا، جنھوں نے اہم جنگی مقامات فتح کیے، ان ہی میں مصیصہ کے علاقے حصن بولق، حصن اخرم حصن بولس، حصن عموریہ اور نواحِ آذربایجان کے بعض علاقے تھے، بحیرۂ روم میں جزیرۂ میورقہ اور منورقہ فتح ہوئے۔

سلیمان بن عبد الملک (۹۶ تا ۹۹ھ) کے عہد میں جرجان، طبرستان اور قہستان کی فتح ہوئی، یزید بن عبد الملک کے دور حکومت میں ترکستان، خزر، قبچاق اور ارمن کے علاقے زیر نگیں ہوئے، ہشام بن عبد الملک (۱۰۵ تا ۱۲۵ھ) کے زمانہ میں ایشیائے کوچک کے علاقے قونیہ، کمخ، قیساریہ، طیبہ، صملہ، خرشنہ اور مطمورہ وغیرہ فتح ہوئے، اسی کے عہد میں فرانس کو فتح کرنے کی کوشش کی گئی، سروانہ اور صقلیہ پر بھی حملے کیے گئے، ہشام کی فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس نے مشرق میں ترک و تاتار اور مغرب میں بربر کی قوت کا خاتمہ کر دیا، رومیوں کو اسلامی حدود کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، جہاں جہاں خوارج نے سر اٹھایا فوراً ان کو کچل دیا، پھر انھیں شورش برپا کرنے کا حوصلہ نہ ہوا، اسلامی سلطنت کے ہر حصہ میں فتوحات ہوئیں، جن کا ذکر شاہ صاحب نے کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ اس زمانہ کے عربوں کی سپہ گری کے کارنامے پڑھ کر فخر ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کو حکمرانوں کے کارناموں کا جائزہ لے کر ان کا ناقدانہ تجزیہ کرنے کا خاص ملکہ ہو گیا تھا، اس لیے بنو امیہ کے خلفاء کی سیرت و کردار پر بھی اچھی روشنی ڈالتے گئے ہیں، جس سے ان کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے آتے گئے ہیں، مثلاً امیر معاویہؓ کے متعلق لکھتے ہیں: ان کے زمانے میں نظام خلافت میں سب سے بڑا انقلاب یہ ہوا کہ خلافت اسلامیہ موروثی و شخصی حکومت کے قالب میں آگئی، جس سے اس کی اصل روح بدل گئی، لیکن اس کا ظاہری ڈھانچہ وہی رہا، جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں تھا، بلکہ انھوں نے اس کو مختلف حیثیتوں سے اور زیادہ ترقی دی، مسلسل خانہ جنگی سے نظام خلافت میں جو برہمی پیدا ہو رہی تھی، اسے از سر نو قائم کیا، اندرونی اور بیرونی مخالف طاقتوں کا خاتمہ کر کے امن و سکون پیدا کیا، بغاوتیں فرو کیں، ملک فتح کیے، تمدنی ضروریات کے مطابق بہت سے نئے نئے شعبے قائم کیے اور اپنے بعد ایک وسیع اور طاقتور حکومت چھوڑ گئے (ص ۳۹)

مگر اسی کے ساتھ شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کی ناحق صف آرائی اس کی کامیابی کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل کا استعمال، حضرت علیؓ پر سب و شتم، یزید کی ولی عہدی یہ سب ان کی ایسی کھلی ہوئی غلطیاں ہیں جن سے کوئی حق پرست انکار نہیں کر سکتا۔

عبد الملک بن مروان کے متعلق بتاتے ہیں کہ اس نے اپنے استقلال، ہمت اور شجاعت سے نہ صرف تمام مخالف حالات پر قابو حاصل کر لیا بلکہ نئی فتوحات بھی حاصل کیں، سندھ سے لے کر جبر الٹر تک ایک متحدہ حکومت قائم ہو گئی، اور اس کے جانشینوں کو اطمینان کے ساتھ تعمیری کاموں کا موقع ملا، مگر بعض ایسے واقعات بھی ہیں جن سے عبد الملک کے دامن پر دھبہ آتا ہے، مثلاً اس نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے جنگ کرنے میں خانہ کعبہ پر سنگ باری کی، اسی کے عہد میں مشہور صحابی حضرت انس بن مالکؓ، اور مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیبؒ اور دوسرے تابعین کی تحقیر و تذلیل ہوئی، گو ان واقعات میں اس کے عمال کا ہاتھ رہا، لیکن اس سے وہ یکسر بری بھی نہیں ہے۔

ولید بن عبد الملک کی یہ ہر ترتیب آرائی کی سبب ہے کہ اس کا دور فتوحات کی کثرت، دولت کی فراوانی، امن و رفاہیت

قیام، اور دوسری ملکی اور تمدنی ترقیوں کے لحاظ سے بنی امیہ کا عہد زریں ہے، اس نے فوجی نظام میں بڑی ترقی دی، جہاز سازی کے نئے نئے کارخانے کھولے گئے، رعایا کے لیے رفاہ عام کے اتنے کام انجام دیے گئے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کے علاوہ اس کی نظیر نہیں ملتی، سڑکیں درست ہوئیں، نہریں کھدوائی گئیں، مسافروں کے لیے جابجا مہمان خانے قائم ہوئے، سارے ملک میں شفاخانے کھولے گئے، بھیک مانگنے کی ممانعت کی گئی، اپاہجوں کی خدمت کے لیے آدمی مقرر کیے گئے، یتیموں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا، نظام تعلیم میں ترقی دی گئی، مسجد نبوی کی تزئین و آرائش اور جامع دمشق کی تعمیر میں بے دریغ دولت صرف کی، اس کی آرائش میں اس زمانہ کی تمام صناعیاں ختم کر دیں، وغیرہ وغیرہ، ان تمام خوبیوں کے ساتھ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑا سخت گیر تھا، اس لیے اس کے زمانہ میں ہزاروں آدمی قید و بند میں مبتلا ہوئے۔

سلیمان بن عبد الملک کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ حکومت کے عمال کی اصلاح تھی جن کے مظالم اور بدعنوانی سے اموی خلفاء بدنام ہو رہے تھے، خود خلفاء کچھ ایسے جابر و ظالم نہ تھے، بلکہ عام دنیاوی حکمرانوں کی طرح ان میں اچھے بھی تھے، برے بھی، یہ بھی ممکن ہے کہ ان سے کچھ ظالمانہ افعال سرزد ہوئے ہوں اور ضرور ہوئے، لیکن ظلم کرنا ان کی طبیعت کا خصوصی رنگ نہ تھا، بنو امیہ کے بعض عمال خصوصاً حجاج اور اس کے ماتحت حکام ظالم اور مطلق العنان تھے، ان کی مطلق العنانی کا بہت کم تدارک کیا جاتا، اس لیے ان کے مظالم بھی خلفاء کی طرف منسوب ہو گئے، سلیمان نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا، اس لیے تخت نشینی کے ساتھ ہی اس نے عمال کا مواخذہ و احتساب شروع کر دیا، اس کے دور سے پہلے جو لوگ ناحق قید کیے گئے تھے سب کو رہا کر دیا، جلاوطن اشخاص کو واپسی کی اجازت دے دی، اس سلسلہ میں اتنے قیدی رہا کیے گئے کہ قید خانے خالی ہو گئے، شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ جو سیکڑوں کارناموں اور اصلاحوں سے بڑھ کر ہے وہ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کی ولیعہدی ہے، جنھوں نے اموی سلطنت کو خلافت راشدہ کے قالب میں بدل دیا، اس کی زندگی کا یہ پہلو دوسرے مسلمان حکمرانوں کیلئے قابل تقلید

ہو سکتا تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ خود سلیمان کے بیٹے اور حقیقی بھائی موجود تھے، جس سے اس کا یہ کارنامہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے، اس لیے حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے زمانہ میں جو اصلاحات ہوئیں اس کی سعادت میں سلیمان کا بھی حصہ ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کی حکومت دو سال پانچ مہینے رہی، مگر انھوں نے اپنے زمانہ میں جو نمایاں کام انجام دیے، ان کی تفصیل بیان کرنے میں شاہ صاحبؒ پر بڑی انشراحی کیفیت طاری ہو گئی ہے، اور یہ عہد اس کا مستحق بھی تھا، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ خوش لباس اور رجاجریب آدمی مانے جاتے تھے، مگر تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی ابوذر غفاریؓ اور ابوہریرہؓ کا قالب اختیار کر لیا، آپ کا اصل مقصد خلافت راشدہ کے دور کا دوبارہ احیاء تھا، اور اس کے لیے پوری کوشش کی جس سے اموی خاندان آزردہ بھی ہوا، خلیفہ بنتے ہی خود انکو اور اموی خاندان کے ارکان کو جتنی جاگیریں ملی تھیں ان کو ان کے اصلی حقداروں کو واپس کیا، اور یہ کام اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کیا، فدک کے علاقہ کی جو صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی اس کو اسی حالت پر لوٹا دیا، خود ان کے خاندان والوں کو بیت المال سے جو وظائف اور گذارے ملتے تھے، بند کرا دیا، بیت المال سے خلفاء کے تعیش پر جو رقم خرچ ہوتی تھی وہ بھی رکوا دی، معذور اشخاص کے لیے وظائف مقرر کیے، ایک عام لنگر خانے سے نقراء اور مساکین کو کھانا ملتا تھا، رعایا میں ایسی خوشحالی پیدا ہو گئی کہ کوئی صدقہ لینے والا نہ ملتا تھا، ظالم عمال ہر جگہ سے نکال دیے گئے، انھوں نے ذمیوں کے حقوق کی حفاظت میں عہد فاروقی کی یاد تازہ کر دی، ممالک محروسہ میں بکثرت سرائیں بنوائیں، ہر طرف احیائے شریعت اور استیصال بدعت کے احکام جاری کیے، نماز کے اوقات کی پابندی سختی سے کرائی، زکوٰۃ کا باضابطہ نظام قائم کیا، خطبہ میں حضرت علیؓ پر جو لعن طعن کیا جاتا تھا اس کو رکوا دیا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے اس وقت تک جو خوں ریزی ہو رہی تھی اس کو روکنے کے لیے اتنی احتیاط برتی کہ سرکش اور فتنہ جو اسلامی فرقوں کے مقابلہ میں سرگرم تھے ان کے خلاف بھی تلوار نہ اٹھائی، خارجی نہ صرف حکومت کے

خلاف تھے، بلکہ ان کا وجود امن عامہ کے لیے بھی خطرناک تھا، ان کے مقابلہ میں بھی تلوار روک لی، ان اوصاف کے ساتھ وہ علمی اعتبار سے جلیل القدر عالم تھے، اس عہد کے اکابر علماء ان کے سامنے طفلِ دلبستاں تھے، ان کے دربار میں علماء و فقہاء کا بڑا اچھا اجتماع ہو گیا تھا، ان کا سب سے بڑا مذہبی کارنامہ احادیثِ نبوی کی حفاظت اور ان کی اشاعت ہے، ان کا ایک مجموعہ مرتب کرا کے تمام ممالک محروسہ میں بھجوایا، مغازی اور سیرت کے درس کا انتظام کیا، ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ برابر گریہ و بکا کرتے رہتے، لوگ اس کے متعلق کچھ کہتے تو فرماتے کہ تم لوگ رونے پر مجھے ملامت نہ کرو، کیونکہ اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو اس کے بدلے میں عمر پکڑا جائے گا، رات کو جب تک خلافت کا کام کرتے تھے اس وقت تک بیت المال کی شمع جلاتے تھے، اس کے بعد گل کر کے اپنا ذاتی چراغ جلاتے تھے، مرض الموت میں ایک قمیص کے علاوہ دوسری نہ تھی، ان کے سالے مسلمہ بن عبد الملک نے اپنی بہن سے کہا کہ قمیص میلی ہو گئی ہے، لوگ عیادت کو آتے ہیں، دوسری بدلوا دو، وہ سن کر چپ رہیں، مسلمہ نے جب دوبارہ کہا تو بولیں خدا کی قسم اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں ہے، ایک جوڑا بھی سالم نہ ہوتا، بلکہ پیوند پر پیوند لگے ہوتے تھے، شاہ صاحبؒ ان کے اوصاف پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ عمر بن عبد العزیزؓ کے کارناموں کی مثال دنیا کی کوئی تاریخ کہیں پیش نہیں کر سکتی، بعض مورخین ان کو پانچواں خلیفۂ راشد مانتے ہیں، ان کی حقیقی خواہش تھی کہ یہ موروثی حکومت پھر اسلامی خلافت سے بدل جائے، لیکن یہ بنیادی تبدیلی ان کے اختیار میں نہ تھی، بنی امیہ میں موروثی حکومت اصولی حیثیت سے مسلّم ہو چکی تھی، خواہ خلیفہ بنی امیہ کی کسی شاخ سے ہو، چنانچہ سلیمان خود حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے بعد یزید بن عبد الملک کو خلیفہ نامزد کر گیا تھا، اس لیے انتخابِ خلیفہ کا معاملہ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے اختیار سے بالکل باہر تھا، جس پر وہ عمل نہ کر سکے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے بعد یزید بن عبد الملک کا دور شروع ہوا، شاہ صاحبؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کا زمانہ (۷۲۰ء–۷۲۴ء) بہت مختصر تھا، اس لیے اہم واقعات پیش نہیں آئے، وہ طبعاً بہت

آرام طلب اور عیش پرست تھا، اس لیے تعمیری حیثیت سے اس کے دور میں عراق کے بند و بست کے علاوہ کوئی چیز قابل ذکر نہیں۔

ہشام بن عبد الملک کے متعلق شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ تدبیر، سیاست، بیدار مغزی، اولوالعزمی اور حوصلہ مندی وغیرہ اوصافِ جہانبانی کے اعتبار سے بنی امیہ کے ممتاز خلفاء میں تھا، اس میں امیر معاویہؓ کا حلم و تدبر اور عبد الملک کی سیاست و اولوالعزمی دونوں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں، مورخین لکھتے ہیں کہ بنی امیہ میں ان تینوں پر سیاست و تدبر کا خاتمہ ہو گیا تھا، اس نے افتادہ زمینوں کو آباد کیا، بیت المال میں ناجائز آمدنی کا داخلہ رکوا دیا، اس نے اپنی فوج کے لیے مناسب جگہوں پر مستحکم قلعے تعمیر کرائے، تمام سرحدی علاقوں کو مضبوط کیا، وہاں ہر طرح کا جنگی سامان بکثرت جمع کیا، شام میں رصافہ، سندھ میں منصورہ اور محفوظہ شہر آباد کرائے، حجاج کی آسایش کے لیے مکہ کے راستہ میں حوض اور تالاب بنوائے، ریشمی کپڑوں کی صنعت کو ترقی دی، خود راسخ العقیدہ تھا، مشہور قدری غیلان بن یونس نے جبر و قدر کا مسئلہ پھر سے ابھارا تو اس کو قتل کرا دیا، اسی طرح معد بن درہم نے خلق قرآن کا مسئلہ چھیڑا تو اس کو بھی قتل کرا دیا، امام زہریؒ سے چار سو حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کرایا تھا، آخر میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے پیش روؤں کے برعکس نہایت کفایت شعار تھا، اس کی کفایت شعاری بلکہ بخل کے بہت سے واقعات ملتے ہیں، لیکن ان کی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہیں، البتہ یہ صحیح ہے کہ بڑا کفایت شعار تھا، ایک ایک لباس برسوں پہنتا تھا، اپنے لڑکوں کو بھی سادگی کا عادی بنایا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے بعد بے اندازہ دولت چھوڑ گیا۔

ہشام کے بعد ولید بن یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا تو اس کی حکومت کی مدت ایک سال دو مہینے رہی، اور وہ یزید ثالث کی حمایت میں یمنی قبائل کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا، شاہ صاحبؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی پوری زندگی رندی و سرمستی میں غرق تھی، لیکن اس میں قابل ذکر اوصاف بھی تھے،

اس نے حکومت کی جانب سے محتاجوں، معذوروں اور اپاہجوں کی خدمت کا انتظام کیا، شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتا تھا، خمریات میں بڑا کمال حاصل کیا تھا، موسیقی کا بھی بڑا قدر دان تھا، شاہ صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کا فسق و فجور مسلم ہے، لیکن اس کے الحاد و دہریت کے جھوٹے افسانے بھی اس کی طرف منسوب ہیں کہ اس نے خانۂ کعبہ کی چھت پر شراب پینے کا ارادہ کیا تھا، یا کلام اللہ کی توہین کی، ملحدانہ مضامین لکھے، لیکن ان کی حقیقت ذیبِ داستان سے زیادہ نہیں، وہ بدنام تھا اس لیے بہت سی باتوں کی غلط شہرت ہوگئی۔

یزید ثالث بن ولید تخت نشین ہوا تو اس نے فوج کی تنخواہ کے اضافہ کو گھٹا دیا، اس لیے یزید ناقص کہلاتا تھا، مگر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ عابد و زاہد خلیفہ تھا، چھ مہینے کی حکومت کے بعد وفات پا گیا، یہ مختصر مدت بھی بغاوتوں اور شورشوں میں گذری، اس لیے اس کے عہد کا کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں۔

یزید نے اپنے بھائی ابراہیم کو ولیعہد بنایا تھا، لیکن اس کی خلافت تسلیم نہیں کی گئی، چند مہینوں ہی میں مروان نے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، مگر مروان مشکل سے چھ سال حکومت کرنے پایا تھا کہ بنو عباس کے ہاتھوں اموی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور جس طرح وہ ختم کیے گئے ہیں اس کی دردناک داستان شاہ صاحبؒ نے اس طرح لکھی ہے:

"مروان کے قتل اور اموی حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی بنی عباس کے جذبۂ انتقام کو تسکین نہ ہوئی، انھوں نے عوام کے دلوں پر اپنا رعب اور دبدبہ بٹھانے کے لیے نہایت بے دردی سے اموی خاندان کا نام و نشان مٹایا، جو اموی جنگ میں مارے گئے ان کے علاوہ نوّے زندہ گرفتار ہوئے، ایک دن یہ سب عبداللہ بن علی کے ساتھ کھانے کے لیے دسترخوان پر آئے تھے کہ ایک شخص شبل بن عبداللہ نے بنی امیہ کے اشتعال دلانے والے چند اشعار پڑھ دیے، عبداللہ نے اسی وقت کل امویوں کو ڈنڈوں سے پٹوا کر مروا ڈالا اور ان کی نیم بسمل لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا، اس کے نیچے سے جاں کنی کی سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں، زندوں کے بعد مردوں کی باری آئی، اور اموی خلفاء کی قبریں کھدوا کر ان کی خاک برباد کی، ہشام بن عبدالملک کی لاش سالم نکلی، اسے سولی پر لٹکا کر جلا دیا، غرض اموی خاندان میں صغیر السن بچوں، عورتوں یا ان لوگوں کے علاوہ جو اندلس بھاگ گئے یا روپوش تھے، کوئی زندہ نہ بچا، اس میں ایک عبدالرحمٰن الداخل تھا جس نے اندلس پہونچ کر اموی حکومت قائم کی۔"

شاہ صاحبؒ نے اتنا لکھ کر اس سفّاکانہ رویہ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، انتقام کا یہ نفرت انگیز نمونہ ان کی طرف سے عمل میں آیا جو نہ صرف مذہبی بلکہ خاندانی حیثیت سے بھی اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اور پیرو تھے، آپ کا یہ اسوہ تھا کہ جب مکہ معظمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو اپنے اپنے جانی دشمنوں اور اسلام کی بیخ کنی کرنے والوں سے مخاطب ہو کر پوچھا: تم کو کچھ معلوم ہے، میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ لوگ اگرچہ ظالم، شقی اور بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے، اس کے بعد ارشاد ہوا تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو، کفار مکہ نے جن مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، ان کو ان کے حقوق دلائے جانے کا وقت تھا، لیکن آپ نے حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دستبردار ہو جائیں، بنو عباس کو یہی نمونہ پیش کرنا چاہیے تھا، مگر وہ اپنے رسولؐ کے اسوہ پر عمل کرنے کے بجائے ان ہی بشری کمزوریوں میں مبتلا ہوگئے، جن میں ایسے مواقع پر اور قومیں ہو جایا کرتی ہیں، ان کا یہ نمونہ اسلامی تعلیم کے لحاظ سے قابلِ نفریں ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اموی حکومت کے زوال کا تجزیہ بہت اچھی طرح کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

اموی حکومت کا زوال اس کے قیام کے تقریباً ایک صدی کے بعد ہوا، اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اسلامی خلافت کے بجائے موروثی اور شخصی بادشاہت ہوگئی، اس میں رفتہ رفتہ شخصی حکومتوں کی تمام برائیاں پیدا ہوتی گئیں، شیعیانِ علی اور خارجی ان کے مخالف رہے، ان کی وجہ سے برابر شورشیں

ہوتی رہیں جس سے حکومت کمزور ہوتی چلی گئی۔

دوسرا سبب ولی عہدی کا نظام تھا، ایک وقت میں یکے بادیگرے ایک سے زیادہ ولی عہدوں کی نامزدگی سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں، پہلا ولی عہد تخت نشینی کے بعد اپنے بعد کے ولی عہد کو جو بیشتر اس کا بھائی یا اور کوئی قریبی عزیز ہوتا تھا محروم کرکے اپنے لڑکے کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا، جس سے خاندان میں پھوٹ پڑجاتی تھی، عمالِ سلطنت میں جماعت بندی ہوجاتی تھی، انھیں بہرحال مخالفت یا حمایت کرنی پڑتی تھی اس لیے بعد میں ہونے والا خلیفہ اپنے مخالف امراء سے انتقام لیتا تھا، اس سے ان میں بددلی پیدا ہوتی تھی اور اموی حکومت ان کی ہمدردی سے محروم ہوجاتی تھی۔

تیسرا سبب ان امراء اور ارکینِ سلطنت کی ناقدردانی اور بدسلوکی تھی جن کی قوت کے بل پر اموی حکومت قائم تھی، خلیفہ بڑے بڑے فاتحین اور امراء سے ناراض ہوتا تو ان کو ان کے عہدہ سے معزول یا قتل کرادیتا، اس طرح حکومت کے ساتھ وفاداری اور جاں نثاری کا جذبہ باقی نہ رہتا تھا۔

چوتھا اور سب سے آخری سبب جس نے اموی حکومت کا خاتمہ کیا' عدنانی اور قحطانی یا مصری اور یمنی قبائل کا باہمی تعصب اور ان کی خانہ جنگی تھی' یہ دونوں زمانۂ جاہلیت کے پرانے حریف تھے' اسلام نے ان کو متحد کردیا تھا، مگر جب اسلامی روح کمزور پڑتی گئی تو یہ تعصب ابھرتا گیا اور اتنا بڑھا کہ بنو عباس نے ان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اس حکومت ہی کو ختم کردیا۔

اس کتاب کا آخری باب اموی دور کی علمی حالت ہے، جو بہت زیادہ طویل نہیں، لیکن بہت ہی جامع ہے، اس کو شاہ صاحبؒ نے اپنی تحریر کی خوش سلیقگی سے کچھ اس طرح سمیٹا ہے کہ اس دور کی علمی سرگرمیاں نظر کے سامنے آجاتی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اموی خلفاء سخن سنج اور شاعری کے قدردان تھے' اس لیے اس دور میں شاعری میں کمیت اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے ترقی ہوئی، بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے، حنظل، جریر، فرزدق، اعشیٰ اور نابغہ وغیرہ فحول شعراء اسی زمانہ میں تھے، جنھوں نے اسلامی دور کی

شاعری کو چمکایا۔

اس دور کی جماعت بندی سے خطابت کو بھی ترقی ہوئی اور متعدد نامور خطیب پیدا ہوئے، حجاج ابن یوسف ثقفی اور طارق ابن زیاد فاتح اندلس اس دور کے بڑے ممتاز خطیب تھے، شاہ صاحب کا خیال ہے کہ حجاج کا وہ خطبہ جو اس نے حکومت پر تقرر کے وقت دیا تھا اور طارق کا اندلس کی فوج کشی کے وقت کا خطبہ عربی زبان کے بہترین خطبوں میں ہیں۔

اموی حکومت کے دفتری کاروبار پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ یہ بہت وسیع ہوگیا تھا، عبد الملک نے عربی کو سرکاری زبان قرار دیا تھا، اس لیے غیر قوموں کے لیے بھی اس کا سیکھنا ضروری ہوگیا تھا، اس سے ان کے اسلوب انشاء کی آمیزش بھی عربی میں ہوئی، ان اسباب کی بناء پر عربی انشاء میں بڑی ترقی ہوئی، اس زمانہ میں حکمرانوں سے لے کر امراء تک کاتب (میر منشی) رکھتے تھے، ان کے لیے انشاء میں مہارت ضروری تھی، بلکہ انشا ہی ان کا سب سے بڑا وصف و کمال تھا، اس لیے اس زمانہ میں انشاء نے مستقل فن کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔

شاہ صاحبؒ کا خیال ہے اس دور میں سب سے زیادہ ترقی حدیث میں ہوئی، اس زمانہ میں اس کا ایک عام ذوق پیدا ہوگیا تھا، دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں درس حدیث کے حلقے قائم تھے سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، سالم بن عبد اللہ، طاؤس بن کیسان، امام شعبی، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ، عطاء ابن ابی رباح، عکرمہ، نافع مولیٰ ابن عمر، علقمہ بن قیس، قتادہ بن دعامہ سدوسی، مجاہد بن جبیر، محمد بن سیرین، محمد بن مسلم زہری، محمد بن منکدر، مکحول شامی جلیل القدر محدث تھے، ان کی روایات پر امہاتِ کتبِ حدیث کا مدار ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اسی دور میں ربیعہ بن فروخ، ابراہیم نخعی، امام شعبی، امام جعفر صادق، عبد الرحمن بن ابی سلمیٰ اور قاضی شریح وغیرہ بہت ہی نامور فقیہ گذرے ہیں'

جن سے فقہ کا سلسلہ پھیلا۔

شاہ صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اسی دور میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوا، اس کی ابتدا مغازی اور سیرت سے ہوئی، اس فن کو سب سے زیادہ فروغ محمد بن اسحاق نے دیا، افسوس ہے کہ ان کی کتابیں ناپید ہیں، سیرت ابن ہشام زیادہ تر ابن اسحاق ہی کی روایات پر مشتمل ہے، جو سیرت کا نہایت معتبر اور قدیم ماخذ ہے، اسی زمانہ میں سلاطین حمیر کے حالات کتاب الاشغال کتاب الملوک واخبار الماضیین، کتاب التاریخ اور سیرت معاویہ لکھی گئیں۔

شاہ صاحبؒ کی اس جلد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دور کے دو بڑے امام لغت تھے، قتادہ ابن دعامہ سدوسی المتوفی ۱۱۷ھ اور ابو عمرو بن العلاء المتوفی ۱۵۴ھ، ابو عمرو نے زبان و لغت کی تحصیل کے لیے برسوں صحرائے عرب کی خاک چھانی تھی اور اس کے متعلق بڑا تحریری ذخیرہ فراہم کیا، گو یہ ذخیرہ کتابی شکل میں موجود نہیں، لیکن وہ عباسی عہد کی تدوین لغت میں کام آیا۔

شاہ صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ نحو پر عیسیٰ بن عمرو ثقفی المتوفی ۱۴۷ھ نے الجامع اور کتاب المکمل لکھی، اسی سلسلہ میں قرآن مجید پر نقطے اور اعراب لگائے گئے۔

پھر اس کتاب سے یہ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کہ یزید بن معاویہ کے لڑکے خالد کو عقلی علوم سے بڑی دلچسپی تھی، فلسفہ اور کیمیا کا خاص ذوق رکھتا تھا، اس نے کیمیا پر کئی کتابیں لکھی تھیں، ان میں سے کتاب الحرارۃ، کتاب الصحیفۃ الکبیر اور کتاب الصحیفۃ الصغیر ابن ندیم کی نگاہ سے گذری تھیں، اسی دور میں ایک اسرائیلی طبیب ماسرجویہ نے اہرن القس کی قرابادین کا ترجمہ عربی میں کیا۔

یہ لکھنا غلط نہ ہوگا کہ شاہ صاحبؒ نے بنو امیہ کی تاریخ قلمبند کرنے کے سلسلہ میں بہت سی تفصیلات چھوڑ دی ہوں گی، ظاہر ہے کہ سب کو سمیٹنا ممکن بھی نہ تھا، اور اب تو ایک ایک خلیفہ پر ایک ایک کتاب علحدہ سے لکھی جا سکتی ہے، مگر شاہ صاحب نے جتنے واقعات سمیٹے ہیں ان کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ

اس خاندان سے متعلق جتنے ضروری معلومات حاصل ہونے چاہیے تھے وہ حاصل ہو جاتے ہیں، اور پھر لڑائیوں، بغاوتوں، شورشوں اور باہمی رقابتوں کے ساتھ فتوحات کی معرکہ آرائیوں، نظم و نسق کی ترقیوں اور علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی گوناگوں تفصیلات کو سمیٹنا کچھ آسان کام تھا بھی نہیں، لیکن شاہ صاحبؒ نے ایک کامیاب مورخ کی طرح ان کو بڑی چابکدستی سے سمیٹا ہے، گو اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اور کتابوں میں بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے، مگر جس انداز میں شاہ صاحبؒ نے ان جانے بوجھے واقعات کو قلمبند کیا ہے وہ اس کی اصل خوبی ہے۔

(باقی)

سلسلہ تاریخ اسلام

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ اور سلسلۂ سیر الصحابہؓ کے علاوہ جو علی الترتیب سات جلدوں اور بارہ جلدوں پر مشتمل ہے ایک اہم سلسلہ تاریخ اسلام بھی ہے جو سولہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں حسب ذیل چار جلدیں مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے قلم سے ہیں جو بہت مقبول ہیں اور ہندوستان و پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں میں تاریخ کے نصاب میں بھی شامل ہیں تاریخ اسلام حصہ اول یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ۔ قیمت ... ۱۷ تاریخ اسلام حصہ دوم۔ خلافت راشدہ کے بعد خلافت بنی امیہ کی صد سالہ تاریخ جس میں خلفائے بنی امیہ میں سے ہر ایک کے کردار پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی اچھائیاں اور برائیاں دونوں دکھائی ہیں۔ قیمت ... ۱۵ تاریخ اسلام حصہ سوم، خلافت بنو عباس کی دو صدیوں کی تاریخ۔ قیمت ... ۱۸ تاریخ اسلام حصہ چہارم، خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی بہت ہی مفصل اور جامع تاریخ، قیمت ... ۱۹

اسی سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کی ایک اور کتاب بھی داخل ہے اور وہ "اسلام اور عربی تمدن" ہے، جس میں اسلام، اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا بہت مدلل جواب دیا گیا ہے۔ قیمت ... ۱۷

بدایوں کے حمیدی خاندان کی علمی و ادبی روایات

از ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی،

مورخ شہیر علامہ سید سلیمان ندوی، بدایوں کی علمی عظمت کی نشان دہی اس طرح فرماتے ہیں،[1]

"اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل بدایوں معلوم ہوتی ہے، حضرت سلطان الاولیا نظام الدین بدایونی دہلوی وہ سیاح معرفت ہیں، جنھوں نے بدایوں اور دہلی کی منزلوں کو ملا دیا، اس زمانے میں اس سرزمین کے دوسرے نامور مولانا علاء الدین اصولی بدایونی (استاد نظام الدین اولیا)، قاضی جمال ملتانی، رکن الدین بدایونی، خواجہ نخشبی بدایونی وغیرہ ہیں"۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ان سطور کی وضاحت اس طرح کی ہے،[2]

"بدایوں کی علمی فضا کو جس واقعہ نے چار چاند لگا دئے وہ فتنہ منگول تھا جب وسط ایشیا میں منگولوں کا طوفان کف بر دہاں امنڈ نا شروع ہوا تو وہاں کے علما اور اکابر کی کثیر تعداد ہندوستان کی طرف رجوع ہو گئی، حضرت شیخ نظام الدین اولیا کے دادا اور نانا جب ہندوستان آئے تو بدایوں ہی کو اپنا مستقر بنایا، اسی طرح حضرت شیخ شاہی روشن ضمیر کے والد ماجد لمین سے، مولانا علاء الدین اصولی کے والد ماجد قبا سے اور شہاب الدین، ہمرہ سے بدایوں میں آکر مقیم ہوئے، مولانا ضیاء الدین نخشبی اپنے وطن نخشب کو چھوڑ کر جب ہندوستان آئے تو بدایوں نے

---

[1] حیات شبلی (مقدمہ) از علامہ سید سلیمان ندوی (اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء) ص ۶ [2] تاریخی مقالات از پروفیسر خلیق احمد نظامی (ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۶ء) ص ۴۶ - ۴۷

ان کے دامن دل کو پکڑ لیا، غیر ملکی علما و مشائخ کے علاوہ خود ہندوستان کے بہت سے علاقوں سے مشاہیر بزرگ یہاں آکر قیام پذیر ہو گئے، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ایک بھائی نے بدایوں کو اپنا مسکن بنایا، حاجی جمال سہروردی اپنے سلسلہ کے مرکز ملتان کو چھوڑ کر بدایوں میں رہنے لگے، شیخ احمد نہروالی اور دیگر بزرگوں نے اس زمین میں کچھ ایسی کشش محسوس کی کہ جب یہاں آگئے تو پھر کہیں جانے کا نام نہ لیا، سلاطین کی کوششوں اور علما و مشائخ کی جد و جہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ بدایوں علم و فضل اور ارشاد و تلقین کا ایک عظیم الشان مرکز بن گیا...... چپہ چپہ پر ارشاد و تلقین کی محفلیں آراستہ ہوئیں اور ساری فضائیں روح پرور نغمات سے معمور ہو گئیں"۔

فتنہ منگول اور دوسرے اسباب کی بنا پر مختلف دیار و امصار سے مسلمانوں کے اکثر شعوب و قبائل بدایوں آکر متوطن ہو گئے اور ایک طرح سے شمالی ہند کا یہ شہر ترک اور پٹھانوں کی چھاؤنی بن گیا، افسوس کہ عصری تاریخوں میں ان کے حالات محفوظ نہ ہو سکے۔

بدایوں کے قدیم خاندانوں میں سادات قبائی، عثمانی، متولی، حمیدی، فرشوری اور دانشمندی وہ ہیں جو بدایوں میں مسلمانوں کی اولیں آبادکاری کے زمانہ میں پہنچے اور انھوں نے یہاں کے علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ارتقا میں حصہ لیا۔

متولی، حمیدی، فرشوری اور دانشمندی چاروں خاندان اپنا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاتے ہیں، اور ان خاندانوں کے شجرے تقریباً بیسویں صدی کے آغاز میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصہ شہود پر آئے ہیں،

یہاں ہمیں خاندان حمیدی کے منتخب مشاہیر اور ممتاز اصحاب علم و فضل کا تعارف مقصود ہے۔

حمیدی خاندان امارت ووجاہت اور علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز رہا ہے، اس میں امراء و رؤساء زمیندار ومعافی دار بھی گزرے ہیں اور علماء وفضلاء وحکماء وفقہاء اور ارباب شعروادب بھی، مسلمانوں کے عہد اقتدار میں افتاء وقضاء کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور دوسرے عہدوں اور مناصب پر بھی فائز رہے، جب انگریزوں کا دور آیا تو اس وقت بھی حکومت کے کارپرداز بنے، خاندانی مورخ مفتی شیخ شرف علی حمیدی بدایونی لکھتے ہیں:[7]

"پس آغاز دور سلطنت سرکار کمپنی انگریزی ردنمود وبجائے محکمۂ احتساب محکمۂ ججی قائم گردید۔ افسران آں، جج وصدر الصدور، وصدر امین ومنصف نامزد شدند۔ بہ اکثر ازیں عہدہ ہائے جلیلہ اولاد قاضی زادگان بدایوں از نسل شیوخ صدیقی حمیدی مامور شدند چنانچہ مولوی کاظم علی خلف اکبر مولوی قائم علی ومولوی منظر حسن ..... بہ منصب صدر الصدوری کہ آں را سب ججی نیز گویند، فائز گردیدند، مولوی کرامت اللہ ..... بہ منصب صدر امینی مولوی فیض الرحمٰن ..... مفتی غلام سید ..... منشی عظمت علی ..... مولوی مبارک اللہ بہ عہدۂ منصفی شدند۔"

بدایوں میں اس خاندان کی آمد کے سلسلہ میں خاندانی روایت یہ ہے کہ غیاث الدین بلبن کے عہد میں وارد بدایوں ہوا، یہی وہ زمانہ ہے کہ ماوراء النہر، ترکستان، ایران غرض ساری اسلامی دنیا کو منگولوں نے تباہ وبرباد کر رکھا تھا، ہلاکو اور چنگیز خان کی اولاد واعقاب کی خون آشام تلواریں مسلمانوں کا قتل عام کر رہی تھیں، کہا جاتا ہے کہ اس دودمان خیر کے پہلے بزرگ شیخ حمید الدین مخلص تھے کہ جو وارد بدایوں ہوئے اور ان ہی بزرگوار کی نسبت سے یہ حمیدی خاندان کہلایا۔

[7] تاریخ بنی حمید (فارسی) قلمی مملوکہ جناب اوج بدایونی ص ۴۰ — ۴۷

شیخ حمید الدین مخلص گنوری المشہور بہ داد احمید ابن ملا بدر الدین از اولاد محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ وفات ۷۱۱ھ[1] ان کے بیٹے شیخ صدر الدین بدایوں کے قاضی ہوئے۔

اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ افضل محمد تھے جنھوں نے مشہور عالم ومفسر قاضی شہاب الدین دولت آبادی (ف ۸۴۹ھ / ۱۴۴۵ء) کی تفسیر بحر مواج پر حاشیہ لکھا اور ایک رسالہ عذب البیان فی علوم القرآن بھی ان کی تالیف ہے، افضل محمد کا انتقال ۹۶۶ھ میں ہوا۔[2]

قاضی بدر الدین بدایونی نے صدرا پر حاشیہ لکھا، جو ان کے نام کی مناسبت سے بدر مشہور ہوا

"بدر حاشیۂ صدرا از مشہور ترین تصانیف وے است"۔[3]

عہد عالمگیری میں قاضی محمد جلیس نقشبندی بدایونی مرید شیخ معصوم سرہندی المتوفی ۱۱۱۶ھ اور مولانا شیخ خلیل اللہ پسر شیخ جان محمد بدایونی المتوفی ۱۱۲۲ھ کے نام بھی ممتاز ہیں،[4]

روہیلہ عہد کے ایک نامور عالم مولانا علی احمد اللہ تھے جو حدیث میں بڑا درک رکھتے تھے، ان کا انتقال ۱۲۲۰ھ میں ہوا، اس دور میں شیخ ظہیر الدین ابن ابو اللیث بن منشی محمد منیر مولف نکات منیری بھی معروف تھے،[5]

مولانا حسن علی چشتی، شاہ فخر الدین دہلوی کے خلیفہ، نامور شیخ طریقت اور صاحب درس وتصانیف تھے، سی۔ پی برادران کی اصلاحی کوششوں کا مرکز رہا، سیونی چھپارہ میں ۱۲۱۹ھ میں انتقال ہوا۔[6]

مولانا احسان اللہ واعظ بدایونی، شاہ اسحاق اور شاہ عبد العزیز دہلویؒ سے شرف

[1] تاریخ بنی حمید کے مطابق حمید الدین کا شجرہ سیدنا صدیق اکبرؓ سے صرف گیارہ واسطوں سے متصل ہوتا ہے، عجب کہ یہ زمانہ کم وبیش پونے سات سو سال کو محیط ہے۔ [2] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۲۰ [3] ایضاً

[4] ایضاً ص ۳۰ خاندانی تذکروں میں ان بزرگوں کا ذکر غیر محققانہ انداز میں لکھا گیا ہے جس میں عقیدت واراد ت کو زیادہ دخل ہے [5] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۲ [5] تاریخ بنی حمید (از انشاء اللہ) امیر اقبال پریس بدایوں ۱۳۲۱ھ (آیندہ حوالہ انشاء اللہ سے دیا جائے گا) [6] ایضاً انشاء اللہ ص ۳۱

تلمذ رکھتے تھے، ۱۲۶۵ھ میں ریاست ٹونک پہنچے، نواب وزیر الدولہ نے بڑی قدر کی، زمرۂ علماء و واعظین میں شامل رہے، ان کے دونوں صاحبزادے مولوی محمد حسن اور حافظ احمد حسن بھی اعلیٰ مناصب پر فائز رہے، مولوی احسان اللہ (ابن شیخ حیات اللہ) ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۱، رمضان ۱۲۹۴ھ کو ہوا، بدایوں میں یہ خاندان "ٹونک والا" مشہور ہے۔[۱]

مولوی شیخ کرامت اللہ، منصف کے عہدہ پر فائز تھے، ان کا کتب خانہ نہایت اعلیٰ تھا، حکمت میں بھی دسترس رکھتے تھے، ۹، شعبان ۱۲۹۷ھ کو انتقال ہوا۔[۲]

مولوی محمد حسین عرف آخوند، نامور عالم اور صاحب درس و تدریس تھے، ۲۹ محرم ۱۳۱۱ھ کو انتقال ہوا۔[۳]

مولوی دلدار علی مذاقؔ ولد شیخ نثار علی (پیدائش ۱۲۳۵ھ - انتقال ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۱۲ھ) نامور شیخ طریقت اور شاعر تھے، پہلے دلدار و عیارؔ تخلص تھا، جب ذوقؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے تو مذاقؔ تخلص اختیار کیا، دیوان طبع ہو چکا ہے، ان کے جانشین، خلیفہ اور فرزند مولوی شاہ ایثار علی بزرگوں کی نشانی تھے۔[۴]

شاہ عبید اللہ المتوفی ۱۶، شوال ۱۳۲۵ھ چشتی سلسلہ کے مشہور شیخ تھے۔[۵]

قاضی علی احمد محمود اللہ شاہ مذنب مذاقی بدایونی ولد علی اسد اللہ (پیدائش ۱۲۷۱ھ انتقال ۹، شعبان ۱۳۲۹ھ) صاحب علم و فضل تھے، تاریخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، انھوں نے عین الانسان (فارسی) اُن علماء و مشائخ کے بارے میں لکھی ہے، جن سے وہ ذاتی طور سے واقف تھے، اسی طرح بدایوں کی عمارت و کتبات پر ایک مختصر سا رسالہ لکھا ہے، یہ دونوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ندوۃ العلماء کی تحریک میں زور شور سے حصہ لیا۔[۶]

---

[۱] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۷۵ تاریخ بنی حمید (از انشاء اللہ) امیر الاقبال پریس بدایوں ۱۳۲۵ھ - انشاء اللہ ص ۱۰۱ [۲] ایضاً ص ۱۰۳ [۳] ایضاً ص ۹۰ [۴] ایضاً ص ۹، انشاء اللہ ص ۲۳ [۵] ایضاً ص ۱۰۱ [۶] ایضاً ص ۱۰۶

مولانا محب احمد قادری ولد ثامن علی (انتقال ۱۱ دسمبر ۱۹۲۲ء) مدرسۂ قادریہ کے فارغ التحصیل مولانا عبد القادر قادری (ف ۱۳۱۹ھ) کے شاگرد خاص، نامور مدرس و عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، ان کے صاحبزادے مولانا محمد ابراہیم قادری تھے جو علمائے سلف کی یادگار تھے، انھوں نے حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مواعظ و خطبات کا اردو میں ترجمہ کیا جو سیف دستگیر کے نام سے چار جلدوں میں بمبئی میں طبع ہوا تھا، حضرت مولانا، خاکسار راقم الحروف پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔[۱]

خاندان حمیدی کے دو نامور عالم مولانا لائق علی ولد مولوی قائم علی اور مولوی حشمت علی بریلی میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے، مولانا لائق علی کے متعلق مؤلف عین الانسان لکھتے ہیں۔[۲]

"عالم صوری و معنوی و صائم الدہر بود و بسلسلۂ نقشبندیہ داشت ۹ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ در گذشت، مرد متقی و واعظ شیرین گفتار و قاری خوش الحان بود...... مدۃ العمر در درس و تدریس بسر برده۔"

مولوی حشمت علی، بریلی (محلہ گڑھیا) میں رہتے تھے، مدرسہ منظر الاسلام سے فارغ التحصیل ہوئے، فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاںؒ نے مشاہیر علماء و مشائخ کے جلسہ میں دستار فضیلت باندھی، تمام عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا، ان کی کتاب نصرۃ الواعظین (دو جلد) نہایت مقبول ہوئی، علماء و مشائخ کی طرح اس خاندان میں نامور اطباء بھی ہوئے،

حکیم مجید اللہ ابن حکیم قادر بخش - طبیب نامی بود، از تلامذۂ حاذق الملک حکیم شریف خاں دہلوی۔[۳]

حکیم قدرت اللہ ولد مفتی محمد حاکم - در حذاقت طب عدیلے نداشت۔[۴]

---

[۱] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۵۲ تاریخ بنی حمید (از انشاء اللہ) امیر الاقبال پریس بدایوں ۱۳۲۵ھ، ص ۱۰۶ [۲] عین الانسان از علی احمد محمود اللہ (وکٹوریہ پریس بدایوں) ص ۶۲ [۳] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۱۵۱ [۴] ایضاً

حکیم وقار اللہ، حکیم سعید اللہ۔ حکیم وحید اللہ اور حکیم فخر الدین بھی علم طب میں ماہر و کامل تھے[1]،
اس خاندان میں نامور مصنفین و مورخین بھی ہوئے چند ممتاز مورخین کے اسماء درج ذیل ہیں۔

مولوی عبد الوالی ولد عبد الباقی (۱۲۱۷ھ - ۱۳۰۳ھ)

ملا نصیر ملتانی کی کتاب طبقات الاولیاء کی شرح فارسی زبان میں "باقیات الصالحات" کے نام سے لکھی، اس کتاب کے دو ایک خطی نسخے تقسیم ہند ۱۹۴۷ء سے قبل بدایوں میں تھے۔

مفتی شیخ شرف علی حمیدی ولد شیخ ببر علی (۱۲۴۳ھ - ۱۳۳۰ھ) ....

.... مولوی عبد الوالی چشتی کی فارسی کتاب "باقیات الصالحات" کا اردو ترجمہ کیا اور اس میں مزید اضافے بھی کئے۔ مترجم مرحوم کے فرزند حکیم محمد یٰسین شوق (ف ۱۹۳۶ء) کے بھی ہاتھ کا نقل کردہ نسخہ ہمارے پیش نظر رہا ہے، اسی کی ناکام تلخیص مع اضافہ جدید و اغلاط مزید "مردانِ خدا" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں بدایوں سے شائع ہوئی ہے،

مفتی شرف علی مرحوم نے حمیدی خاندان کے مشاہیر کے حالات فارسی زبان میں تاریخ بنی حمید کے نام سے لکھے ہیں، یہ کتاب (۱۳۰۰ھ تا ۱۳۲۴ھ) میں مکمل ہوئی اس کا خطی نسخہ راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔

احمد رضا حمیدی (ف ۱۳۰۵ھ) نے بدایوں کی تاریخ باسم تاریخی "صحیح السیر فی کوائف البلد" ۱۲۷۹ھ میں لکھی ہے، اس کا خطی نسخہ بدایوں میں محفوظ ہے، ۶۰ صفحہ ہوا اس کتاب کا تفصیلی تعارف ذوالقرنین بدایوں میں شائع ہوا تھا،

حکیم وحید اللہ ولد حکیم سعید اللہ تاریخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، انھوں نے تاریخ کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں، (۱) مختصر سیر ہندوستان (فارسی) تالیف ۱۲۶۰ھ اکابر و مشاہیر کے ذکر میں ہے،

[1] تاریخ بنی حمید (فارسی) صفحہ ۲۶ [2] ایضاً ص ۸۰

(۲) آئینہ جہاں نما، بلاد و امصار کے بیان میں ہے، یہ دونوں کتابیں خاکسار محمد ایوب قادری کے کتب خانہ میں موجود ہیں، تاریخ روہیل کھنڈ پر حکیم صاحب کی کتاب "تذکرہ حکومت المسلمین" ہے، اس کا خطی نسخہ ہماری نظر سے کتب خانۂ رامپور میں گذرا ہے، انھوں نے ایک کتاب "تاریخ بھرت پور" کے نام سے بھی لکھی ہے، حکیم وحید اللہ اور دوسرے ارکانِ خاندان راجا بھرت پور کے یہاں ملازم تھے، اس لیے یہ خاندان بدایوں میں بھرت پور والا مشہور ہے[1]

قاضی فدا حسین ولد احمد حسین۔ انھوں نے حمید الدین گنوری کے مختصر سے حالات "سیرت الحمید فی احوال السعید" کے نام سے لکھے ہیں، دراصل یہ کتاب اکمل التاریخ مولفہ مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری پر ایک تنقیدی تبصرہ ہے، منشی انشاء اللہ ولد شیخ عطاء اللہ، انھوں نے "تاریخ بنی حمید" کے نام سے اردو زبان میں ایک مکمل شجرہ مع مختصر حالات مرتب کیا جو ۱۳۳۵ھ میں امیر الاقبال پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔ شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ مولوی حشمت علی حمیدی بریلوی نے اپنی شاخ کا شجرہ "شجرۂ خاندانِ عالیہ مجیدیہ حلیمیہ" کے عنوان سے مرتب کرکے صفر ۱۳۴۴ھ میں یوسفی پریس بریلی سے شائع کیا۔ اسی طرح مولوی کریم عالم کی شاخ کا شجرہ شیعہ حسنین نے مرتب کیا ہے جس کا خطی نسخہ حضور عالم صاحب کے پاس ہماری نظر سے گزرا ہے،

مولوی غلام شبیر ولد مولوی غلام حیدر (۱۲۷۵ھ - ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء) نے سیرت پر ایک کتاب "سکینہ فی الاخبار سلطان مدینہ" لکھی جو امیر الاقبال پریس بدایوں سے شائع ہو چکی ہے، شاہ ابو الحسین نوری میاں مارہروی (ف ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء) کے حالات دو جلدوں میں لکھے ہیں، پہلی جلد "نور ومدائح حضور" کے نام سے ۱۳۳۴ھ میں امیر الاقبال پریس بدایوں سے شائع ہوئی، دوسری جلد "تذکرہ نوری" کے عنوان سے راقم الحروف نے سنی دار الاشاعت "لائل پور سے شائع کرائی" اس پر پیش لفظ

[1] انشاء اللہ ص ۴۴،

مولوی عبدالمجید اقبال میاں نے اور تفصیلی مقدمہ خاکسار محمد ایوب قادری نے لکھا ہے،

اکرام عالم وکیل ولد کریم عالم (ف ۱۹۴۲ء) نے "حقیقت رام پور" کے نام سے ایک کتاب لکھی، ملا عبدالقادر بدایونی کے مختصر سے حالات بھی لکھے تھے جو شائع نہ ہو سکے، اکرام عالم مرحوم نے مسلم لیگ کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا، اس تعلق سے ملا عبدالصمد مقتدری ولد غلام حامد (ف ۱۹۶۴ء) اور مولوی شبیہہ الحسنین ولد مولوی اعجاز حسین کے نام بھی قابل ذکر ہیں، ان بزرگوں نے مسلم لیگ کے پیغام کو گاؤں گاؤں پہنچایا اور تحریک پاکستان کو مسلم عوام کے دل کی دھڑکن بنادیا۔

شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حمیدی خاندان کے کئی بزرگوں نے نمایاں حصہ لیا اور جام شہادت نوش کیا، مولوی رضی اللہ ولد ذکی اللہ، اشرف علی نفیس ولد نجف علی اور قاضی تفضل حسین وغیرہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے دار و رسن کو لبیک کہا، قید و بند اور ضبطی جائداد سے تو نہ معلوم کتنوں کو واسطہ پڑا۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

آخر میں ہم ارباب شعر و سخن کا ذکر کرتے ہیں۔

معین الدین فائق ـ عالم و فاضل، شاہ محمد غوث لاہوری کے مرید، سودا کے شاگرد، المتوفی سنہ ۱۱۶۴ھ محفل شعر و ادب میں ممتاز رہے،

"اقسام شعر از مثنوی و قصیدہ و غزل گفتہ۔"[1]

ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

جب سے تجھ ساتھ دل لگایا ہم نے — کیا کیا اندوہ و غم اٹھایا ہم نے
تقصیر نہیں ہے اس میں تیری واللہ — جیسا کیا تھا ویسا ہی پایا ہم نے

[1] تاریخ بنی حمید (فارسی)، ص ۴۰-۴۲

شیخ ظہور اللہ نوا ولد شیخ دلیل اللہ (ف ۱۲۳۶ھ)[1]، علم و فضل میں شہرہ آفاق، شعر و ادب میں طاق، لکھنؤ، حیدر آباد دکن اور ایران کے درباروں میں معزز رہے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، فارسی میں زیادہ کہا ہے، قصائد، دیوان خطی صورت میں موجود ہیں، مثنوی وامق و عذرا چھپ چکی ہے، ان کے خطوط کا مجموعہ شیخ محمد سلیمان بدایونی (ف یکم جون ۱۹۶۳ء) کے پاس راقم الحروف کی نظر سے گزرا تھا،

نوا ۱۷۹۹ء میں ایران پہنچے مرزا ذکی نے خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا

بلبل رنگین نوا شیریں غزل خواں آمدہ — طوطئ ہندوستان در شکرستاں آمدہ

نوا نے فی البدیہہ کہا۔

تنگ دل، بیمار جاں، برلب بہ ایراں آمدم — اندریں دار الشفا محتاج درماں آمدم

اس زمانہ میں فتح علی شاہ قاچار (۱۷۹۷ء تا ۱۸۳۴ء) سریرآرائے سلطنت تھا، نوا نے ایک قصیدہ شاہ قاچار کی خدمت میں پیش کیا اور اس میں ہندوستان کی سیاسی بدحالی اور فرنگیوں کے استبداد کا نقشہ کھینچا ہے، ہمارے بدایونی شاعر کی یہ پہلی آواز ہے جو فرنگیوں کے خلاف اٹھی، چند شعر ملاحظہ ہوں،

در ہند از بد گوہراں آفت پدید ار آمدہ — شد سبز نخل فتنہ با ظلم و بلا بار آمدہ
مغلی ست مفت ناکساں قاضی ابقائے شترگراں — در عرصۂ ہندوستاں شاہی بہ سنار آمدہ
احوال ہندوستاں زمن کن گوش اے شاہ زمن — در ہند و سند و ہم دکن رایت نگوں سار آمدہ
در خواب مرد بے خبر بیند فرنگی را اگر — آں را بصد عمر دگر مہلت نہ در کار آمدہ
یک فوج آہن خارداں کن جانب ہندوستاں — بر درگہت ایں ہرج خواں از بہر ایں کار آمدہ

[1] تاریخ بنی حمید (فارسی) حصہ ۲۳ بدایوں ۱۸۵۶ء میں از محمد سلیمان بدایونی (کراچی سنہ ۱۹۶۰ء) ص ۱۱-۲۰

سازد زقندش پر دہاں گوید چو مہی ناگہاں   یاراں پئے ہندوستاں شاہم بہ قندھار آمدہ

نوآبدایونی نے غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، معتمد الدولہ محمد آغا فضل علی، حکیم مہدی علی خاں، نقیر محمد خاں گویا، شاہ قاچار، سرجان میلکم اور راجا گوبند بخش کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں۔

نوآ کے اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

مسلماں ہو کے ہم سر آپ کے قدموں پہ رکھتے ہیں   بتو! لو اور کیا کہتے ہو سجدہ تم کو کرتے ہیں،

اس پائے حنائی پہ رکھتا ہوں جو میں سر کو   کس ناز سے وہ کہتا ہے کہ بس سر کو

انھیں کیا لطف ہستی ہو جنھوں نے نازنینوں کی   نہ چشم عشوہ زا دیکھی نہ ساق صندلیں پکڑی

اشرف علی نفیسؔ ولد نجف علی حمتاز (۱۲۳۰ھ۔ ۱۲۷۷ھ) تحصیلدار رہے، جنگ آزادی میں حصہ لیا اور پھانسی پائی، شاعروں کا ایک تذکرہ باسم تاریخی "انتخاب دہر" (۱۲۶۳ھ) لکھا، صاحب دیوان تھے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

تم اگر جنبش ابرو کی دکھادو گے ادا   ایک بے جرم پہ چل جائیں گی شمشیریں دو

دونوں زلفوں میں تمہارے ہے دل وحشی میرا   ایک دیوانے کی گردن میں ہیں زنجیریں دو

چاہنے والے کو رسوا کر دیا قتل کرد   ہے گنہگار جو جی چاہے وہ تعزیریں دو

شفاعت اللہ شفاعت ولد شیخ سخاوت اللہ (ف ۱۲۹۶ھ) وکیل عدالت شاہجہاں پور، شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، فسانۂ عجائب کو "ترانہ غرائب" کے نام سے منظوم کیا، دوسری کتاب منظوم مطہرہ، دونوں کتابیں مطبوعہ ہیں۔

محفوظ علی دردی ولد شیخ محمد اسماعیل (ف ۱۲۴۷ھ) شاگرد شاہ سلامت اللہ کشفی، [۲]

"صاحب تصانیف کثیرہ بود افسوس کہ دیوان فارسی ناتمام گزاشت"

---

[۱] تاریخ بنی حمید (فارسی)، صفحہ ۲۰۱ [۲] تتمیم سخن از عبدالحئی صفا بدایونی ص ۱۳۳، خم خانہ جاوید جلد سوم ص ۱۶

نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہوں میں شہید نرگس بیمار یار کا   خاک شفا غبار ہے میرے مزار کا

شیریں دہنی تو اس کی دیکھو   دشنام میں شان انگبیں ہے،

اب دور آخر کے چند شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے،

اکرام احمد لطف ولد حافظ غلام جیلانی (۱۸۶۲ء۔ ۱۹۴۳ء)

شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے ان کا مندرجۂ ذیل نعت کا شعر مشہور ہے،

رخ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ   نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکان آئینہ ساز میں

محمد نبی سوزؔ (۱۸۶۸ء۔ ۱۹۴۷ء)

فارسی کے قادر الکلام صاحب دیوان شاعر تھے دو شعر ملاحظہ ہوں،

در ساغر زریں دہ اے صاحب میخانہ   دارم دل شاہانہ در کسوت رندانہ

زہے عز و نیاز سوز مسکیں   کہ سنگیں دل بتاں را رام کردند

راشد علی ضیاؔ تلمیذ منیر شکوہ آبادی۔ غزل، مرثیہ اور قصیدہ کہتے تھے ۱۸۹۰ء کے قریب انتقال ہوا، دیوان اور مجموعۂ مراثی غیر مطبوعہ چھوڑے، نمونہ ملاحظہ ہو،

خیال روئے صنم قلب خاکسار میں ہے   خدا کے نور کا پتلا نہاں غبار میں ہے

ہے ترے روئے منور کا دیکھنے والا   یہ ایک وصف ضیائے سیاہ کار میں ہے

افضل علی ضوؔ ولد ہادی علی (پیدائش تقریباً ۱۲۶۶ھ) تلمیذ راشد علی ضیاؔ شعر و شاعری، صحافت اور تصنیف و تالیف میں عمر گزاری، موازنۂ انیس و دبیر کے جواب میں رد الموازنہ لکھا، نمونہ ملاحظہ ہو،

ترا احسان ہوگا اے اجل دم بھر ٹھہر جانا   وہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھ لیں عاشق کا مر جانا

تری زلفوں میں بھی انداز ہے تیری اداؤں کا   سنورنے میں بگڑ جانا بگڑنے میں سنور جانا

انصار حسین زلالی ولد مزمل حسین تلمیذ خواجہ الطاف حسین حالی (ف ۲۱ جولائی ۱۹۲۴ء) نعت و منقبت خوب کہتے تھے، صاحب دیوان شاعر تھے، نمونۂ کلام

چولا ہے اور نہ ہو سکتا ہے اس رخ کے مقابل کا
بڑھتے ہے چودھویں تک اُودھیہ ماہ کامل کا

خیال شاہ دیں تشریف لانا قلب مضطر میں
ہے مہمانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ کے گھر میں

امیر احمد امیر ولد مولوی محمد حسین (ف ۱۹۴۹ء) ٹونک والے، غالب کے رنگ میں کہتے تھے،

اتنے تم گوش ہو گئے ہم
بیگانۂ ہوش ہو گئے ہم

تنہائی و غم امیر مت پوچھ
بیتاب سردش ہو گئے ہم

تولا حسین تولا ولد شیخ الہام اللہ (۱۸۶۷ء - ۱۹۳۶ء)[۱] شعر و سخن میں اعلیٰ دسترس رکھتے تھے، صاحب دیوان شاعر، سلام اور مراثی چھپ چکے ہیں، نثر میں ایک کتاب "الحجاب" لکھی، نمونۂ کلام

جب شمع چلے تو افسردہ جب پھول کھلے تو پژمردہ
یا حسن نظر کا دعوٰی ہے یا حسن میں کامل کوئی نہیں

کل طوافِ ذات میں تھیں جو شعاعیں حسن کی
آج اسی دنیا میں ان کا نام ہم تم ہو گیا

مرتے ہو تو لا بے حجت اس کے تو یہ معنی ہیں حضرت
یا زیست پرائی لائے تھے یا موت پرائی مانگی تھی،

قمر الحسن قمر ولد محسن علی (ف ۱۹۴۱ء) زبان اور فن کے استاد تھے، عبد الرحمٰن راسخ دہلوی سے تلمذ تھا، غزل اور نظم دونوں پر عبور رکھتے تھے، نثر میں بھی کئی کتابیں ہیں، صاحب دیوان شاعر، حلقۂ تلمذ بہت وسیع تھا، نمونۂ کلام

[۱] دید و دریافت از شمس بدایونی در روشن پبلی کیشنز بدایوں ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۲ - ۱۱۵

یوسف ثانی کہا ان کو تو وہ ناخوش ہوئے
اس کا یہ مطلب کہ سمجھا کیوں نہ لاثانی مجھے

یہ اگر سچ ہے کسی کا کوئی دنیا میں نہیں
تم عدو کے کیوں ہوئے ہیں کیوں تمہارا ہو گیا

پوچھا کہ ستمگاری، بولے، ہمیں آتی ہے
پوچھا کہ وفاداری، بولے ہمیں کیا کرنا

بابو علی خاتم آزاد ولد متقی حسن (ف ۱۹۴۰ء) اکبر الہ آبادی کے رنگ میں خوب کہتے تھے، طنز و مزاج میں قادر الکلام، ان کے قطعات ان کے دور کی تاریخ و ثقافت کا آئینہ ہیں، تحریک مسلم لیگ پر بھی قطعات کہے ہیں جس سے ان کی سیاسی فکر کا اندازہ ہوتا ہے[۱]،

حسن فضل بدر ولد علی افضل، شعر کا اعلیٰ ذوق تھا، نمونہ ملاحظہ ہو،

بیمار محبت کو سنبھلتے نہیں دیکھا
آئی کو کسی کے کبھی ٹلتے نہیں دیکھا

ہم خاک نشینوں سے ہے اس درجہ کدورت
مٹی کا انھیں عطر بھی ملتے نہیں دیکھا

خاندان حمیدی کے چار شاعر جام نوائی، محبوب الحسن ارشدی، دلاور فگار اور اوج بدایونی مجلس شعر و سخن کی آبرو ہیں، اسی خاندان حمیدی کی معروف شخصیت ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ولد منشی مظفر علی بدایونی (رجسٹرار عدالت خفیفہ آگرہ) ہیں جن کے علمی و ادبی کاموں سے دنیا واقف ہے،

[۱] دید و دریافت از شمس بدایونی در روشن پبلی کیشنز بدایوں ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۶ - ۱۳۶۔

پروٹسٹنٹ مذہب کی تحریک پر ایک نظر

از

پروفیسر سید علی محسن حیدر آباد،

"یہ مقالہ اس لئے شائع کیا جارہا ہے کہ اس سے اندازہ ہو کہ یورپ میں مذہبی ریشہ دوانیاں کیسی رہیں، اور سیاسی حکمران ان سے کس طرح فوائد اٹھانے کی کوشش کرتے رہے، مذہب نے سیاست کو نہیں بگاڑا بلکہ سیاست نے مذہب میں انتشار پیدا کیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پاپائیت کس قدر مجروح رہی۔" (معارف)

مسیحیت کی دو تلواریں (۱) کلیسا (۲) شہنشاہیت

سولہویں صدی میں یورپ میں مذہب کی متعدد تحریکیں چلیں یہ باہم ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک بنیادی مسئلہ میں متفق تھیں، یہ سب کی سب کلیسائے روم کی مخالف اور اس زمانہ کے رومن کیتھولک مذہب کے خلاف ایک احتجاج بھی تھیں، ایک زمانہ ایسا بھی گذرا جب کہ کلیسائے روم کی عظمت، تقدس اور طاقت کے مقابلہ میں اور تو اور بادشاہ اور شہنشاہ بھی تھراتے تھے، پوپ ہلڈی براند گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان جب اختلاف پیدا ہوا تو شہنشاہ کو اس سلسلہ میں سخت ذلت آمیز ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، بارہویں اور تیرہویں صدی میں کلیسا کی قوت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا، انوسنٹ سوم کے زمانے تک مغربی یورپ کے بادشاہوں پر رومی کلیسا کی برتری قائم تھی، ابتدائی تصور یہ تھا کہ تمام یورپ ایک عظیم تر عیسائی سلطنت ہے جس کی دینی طاقت کا مظہر رومی کلیسا اور دنیاوی طاقت کا سرچشمہ مقدس شہنشاہیت روما ہے یورپ کے دیگر بادشاہ نظری طور پر اس نام نہاد مرکزی ادارے کے ماتحت سمجھے جاتے تھے، کلیسائے روما کی دینی

برتری سب کے نزدیک مسلّم تھی مگر عملی طور پر دنیاوی یا سیاسی اقتدار میں یورپ کے بیشتر بادشاہ شہنشاہ روما کی سیادت ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، اس طرح یورپ ازمنۂ وسطیٰ میں سیاسی اعتبار سے مختلف وحدتوں یا سلطنتوں میں بٹا رہا، مگر دینی اقتدار کا واحد مرکز روم ہی تھا، اور یہیں سے یورپ کی دینی اور سماجی زندگی کو کنٹرول کیا جاتا تھا،

کلیسا کی خدمات

ازمنۂ وسطیٰ کی بے رحمیوں اور سفاکیوں کو بڑی حد تک نرم کرنے میں کلیسا نے بڑی خدمت انجام دی اس کی بے اندازہ دولت رفاہ عام کے لئے صرف کیجاتی تھی، غریبوں کی امداد کیجاتی، مدرسے اور مکاتب چلائے جاتے عوام کو ان کے علاج و معالجہ کی سہولتیں بہم پہونچائی جاتیں، اس دور کے ذہن کی تعمیر و تشکیل بھی اہل کلیسا کے ہاتھ میں تھی، کیونکہ علم کی کنجیاں صرف ان کے پاس تھیں، عامۃ الناس عموماً جاہل اور ان پڑھ تھے، جو کچھ پادری اسقف یا پوپ کہتا اس کو ساری دنیا آنکھ بند کر کے قبول کر لیتی،

کلیسا میں پھوٹ

سولہویں صدی میں کلیسا میں پھوٹ پڑی اس سے پہلے بھی کلیسا میں رخنے پیدا ہوئے تھے، جن کے بعد بعض گروہوں نے مرکزی کلیسا سے نکل کر اپنے اپنے جداگانہ کلیسا قائم کر لئے، اس اختلاف اور افتراق کو ہمیشہ ارتداد یا الحاد کا نام دیا گیا، مسیحی مذہب کی ابتدائی تاریخ میں بھی اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں، قدیم ارتداد کی ایک اچھی مثال ایریانزم[1] کی ہے، بعد کے زمانے میں آرمینیا، عراق، مصر اور حبش کے علٰحدہ علٰحدہ کلیسا اسی نوع کے اختلاف اور بغاوت کے بعد قائم ہوگئے، لیکن سب سے بڑی پھوٹ گیارہویں صدی میں پیش آئی، جس سے کلیسا "مشرق" اور "مغرب" کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئے، خود بازنطینی شہنشاہیت کے صدر مقام قسطنطنیہ میں ایک علٰحدہ کلیسا قایم کر لیا گیا تھا، روم کے پوپ کی روحانی سیادت مسترد کر دی گئی، اور آرتھوڈکس کلیسا کے نام سے اپنی جداگانہ مذہبی تنظیم قائم کر لی، اس کو بعض اوقات یونانی کلیسا بھی کہتے ہیں،

---

[1] یہ تحریک مصر میں پیدا ہوئی تھی ایریس (ARIUS) نامی ایک پادری نے کلیسا کے بعض مسلّمہ عقاید سے انحراف کر کے اس تحریک کو پروان چڑھایا تھا ۳۲۵ء کی پہلی مذہبی کونسل نے اس کے خلاف ارتداد کا فیصلہ صادر کیا، اور اسکو مٹانے کی کوشش کی۔

کیونکہ اسکی مذہبی زبان یونانی قرار دی گئی، جو روما کی مشرقی سلطنت کی سرکاری زبان تھی، چونکہ یہ مشرقی شہنشاہیت کا کلیسا تھا، اس لیے یہ مشرقی کلیسا بھی کہلانے لگا[1] اُس کی وجہ سے یورپ کے مشرقی ممالک کا قدیم کلیسائے روما کا کوئی تسلط باقی نہیں رہا، لیکن یورپ کے دیگر مغربی ممالک سب کے سب کلیسائے روما کے تابع اور وفادار رہے، اور اس افتراق کے بعد اسے رومن کیتھولک کلیسا کے نام سے موسوم کیا جانے لگا، اور اس کی سرکاری زبان حسب سابق لاطینی برقرار رہی، رومن کیتھولک کلیسا نے مشرق کے اس انحراف کو کبھی تسلیم نہیں کیا، اور اس کی پیروی کو ایک قسم کا ارتداد ہی سمجھا گیا، غرض گیارھویں صدی سے دو کلیسا "لاطینی" اور "یونانی" یورپ کے مشرق اور مغرب میں علیحدہ علیحدہ کام کرتے رہے، جہاں تک روما کے کلیسا کا تعلق ہے وہ اس تفریق اور انحراف کے بعد بھی مغربی یورپ میں طاقت ور ہوتا چلا گیا، اور پاپائے روم نہ صرف ایک عظیم مذہبی رہنما تھا، بلکہ سیاسی معاملات میں بادشاہوں اور شہنشاہوں پر بھی اس کا حکم چلتا تھا،

قید بابل

چودھویں صدی کلیسائے روما کے لئے منحوس ثابت ہوئی، ایک طرف تو اس میں تنظیمی خرابیاں پیدا ہوئیں، دوسری طرف اس کے عقائد کے خلاف بغاوت اور احتجاج کی صدائیں بلند ہونے لگیں، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۱۳۰۹ء میں ایک فرانسیسی کا انتخاب پوپ کی حیثیت سے ہوگیا، اس نے فرانس میں اوی نیان کو اپنا پائے تخت بنالیا، رومی چرچ کا صدر مقام اب روم نہیں بلکہ اوی نیان ہوگیا، اس تبدیلی سے پاپائیت کے استحکام میں رخنے پیدا ہوئے، فرانس میں پوپ کی سکونت کی وجہ سے فرانسیسی بادشاہوں کا اثر بڑھ گیا، یہ چیز دوسروں کو کھٹکتی رہی، کلیسا کی تاریخ کے اس دور کو "قید بابل"[2] کا نام دیا جاتا ہے، ۱۳۷۷ء میں یہ دور ختم ہوا اور روم دوبارہ پاپائیت کا

[1] ابتدا میں تو دونوں کلیسا اپنے آپ کو "کیتھولک" اور "آرتھوڈکس" کہتے تھے، لیکن عرف عام میں رفتہ رفتہ ایک کو آرتھوڈکس اور دوسرے کو کیتھولک کا نام دیا جانے لگا۔ [2] یہودیوں کی تاریخ کے اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ وہ سلطنت بابل کے اسیر تھے۔

صدر مقام بن گیا، لیکن بدقسمتی سے اس تبدیلی کے بعد پاپائیت کی اور بھی رسوائی ہوئی، کیونکہ اب ایک کے بجائے دو پوپ ہوگئے، روم کے پوپ کے علاوہ فرانس میں ایک اور پوپ نے جگہ سنبھال لی،[1] اس طرح مغربی یورپ کی مسیحی دنیا میں بیک وقت دو پوپ راج کرنے لگے، کلیسائے روما کی عظمت کو اس سے بہت نقصان پہونچا۔ دونوں پوپ ایک دوسرے کو بے دین، دشمن عیسائیت اور دجّال کہتے تھے، اس جنگ میں یورپی ممالک دو کیمپوں میں منقسم ہوگئے، ایک فرانسیسی پوپ کا طرف دار ہوگیا اور دوسرا رومی پوپ کا حامی تھا، یہ گروہ بندی زیادہ تر سیاسی مصالح کی بنا پر تھی، پاپائیت کا یہ دور "افتراق عظم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، شہنشاہ سگسمنڈ کی کوششوں سے یہ افتراق ۱۴۱۷ء میں ختم ہوا اور یورپ کو کلیسا کے اس خلفشار سے نجات ملی۔

ان واقعات سے کلیسائے روما کی عزت کو کافی نقصان پہونچا پھر اس کو کہیں زیادہ نقصان اُس وقت ہوا جب اس صدی میں پہلے جان وکلف نے انگلستان میں اور اُس کے بعد جان ہس نے بوہیمیا میں کلیسائے روما کے مذہبی عقائد اور اُس کے دینی مسلمات پر شدید حملے اور اعتراضات کرنے شروع کیے،

جان وکلف

جان وکلف (۱۳۲۰-۱۳۸۴) ایک انقلابی پادری تھا، اُس نے کلیسائے روم کے دینی مسلمات کے خلاف تقریر اور تحریر کے ذریعہ ایک جہاد شروع کیا، اس نے عقیدہ "تغیر لحم و دم" کے ماننے سے انکار کیا، جو رومن کلیسا کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، اُس نے رہبانیت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی، پوپ کو حضرت عیسیٰؑ کا خلیفہ اور ان کا جانشین ماننے سے انکار کیا، اور

[1] اوی نیان سے پاپائیت کی منتقلی پوپ گریگوری یازدہم کے دور میں عمل میں آئی (۱۳۷۷ء)، دوسرے سال اس کا انتقال ہوگیا، اسی کے ساتھ ہی اربن ششم نے روم میں اور کلمنٹ ہفتم نے اوی نیان میں اپنے پاپا ہونے کا اعلان کیا،

اعلان کیا کہ صرف وہی لوگ اقتدار کے حامل ہو سکتے ہیں جن کی نیکی اور پارسائی ہر شبہہ سے بالاتر ہو[1]

عوام کو اس نے دعوت دی کہ بائبل کو وہ خود پڑھیں اور اس پر عمل کریں اس کے لیے وہ پادریوں کے محتاج نہ رہیں اس کے لیے اس نے بائبل کا انگریزی میں ترجمہ کیا، کلیسا کو وہ مملکت کا ایک ماتحت ادارہ بنانا چاہتا تھا،

وکلف کی یہ تحریک انگلستان کے نچلے طبقوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، اس کی یہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ عامۃ الناس کلیسائے روما سے بدظن اور بیزار تھے، وکلف کی زندگی تک تو اس پر کوئی آنچ نہ آسکی کیونکہ اس کو انگلستان کے بادشاہ رچرڈ دوم کی تائید حاصل تھی لیکن بعد میں لنکاسٹری بادشاہوں نے کلیسا، کی تائید حاصل کرنے کے لئے اس فرقہ کے پیروؤں پر ایسے مظالم توڑے کہ انگلستان سے لولرڈوں[2] کا نام ونشان ہی مٹ گیا، کم وبیش اسی زمانے میں جان ہس نے بوہیمیا میں وکلف کی تعلیمات کو فروغ دینا شروع کیا، اس نے بھی پوپ کی سیادت اور برتری اور رومن کیتھولک مذہب کے بنیادی عقائد کو ماننے سے انکار کیا، کلیسائے روما ان حملوں کے باوجود اب بھی کافی طاقتور تھا، چنانچہ شہنشاہ سگسمنڈ نے اس موقع پر اس کی بھرپور تائید کی، ہس کو کانسٹنس کی مذہبی کونسل میں مناظرے کے لئے طلب کیا گیا، "جان کی امان" کے وعدے کو بالائے طاق رکھکر کونسل کے فیصلے کے مطابق اسے زندہ جلا دیا گیا، اس کے بعد بوہیمیا میں یہ تحریک بہت کمزور پڑ گئی۔

پندرہویں صدی کے اوائل تک یہ دونوں تحریکیں مٹ گئیں، اور وقتی طور پر کلیسائے روما اس چیلنج کے مقابلے میں بظاہر کامیاب اور سرخرو ہوا، لیکن اس کو ایک عظیم تر آزمائش سے گذرنا پڑا،

---

[1] اس کا مقولہ تھا کہ اقتدار صرف نیکوکاروں کی میراث ہے۔ [2] وکلف کے پیرو لولرڈ کہلاتے تھے،

سولہویں صدی کی اصلاحی تحریکیں

وکلف کے انتقال (۱۳۸۴ء) کے ٹھیک ایکسو سال بعد لوتھر پیدا ہوا (۱۴۸۳ء) سولہویں صدی میں اس کے احتجاج نے اس کام کو مکمل کر دیا جس کو وکلف اور ہس نے شروع کیا تھا، کلیسائے روما کے خلاف لوتھر کی بغاوت نے پورے یورپ میں ایک ہلچل ڈالدی اور رومی کلیسا کی وحدت اور اس کا اتحاد پاش پاش ہو کر رہ گیا، لوتھر اس میدان میں تنہا نہیں رہا، بعض اور مصلحین بھی اپنی اپنی تعلیمات لیکر آگے بڑھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی اصلاحی تحریکیں کم وبیش ایک ہی زمانے میں شروع ہوئیں، رفتہ رفتہ ان میں سے ہر ایک نے اپنا جداگانہ کلیسا قائم کر لیا اور کلیسائے روما سے علیحدگی اختیار کر لی،

اس وسیع انحراف کی وجہ سے کلیسائے روما کی صدیوں پرانی وحدت اور یکجہتی ختم ہو گئی، نئے کلیسا جو وجود میں آرہے تھے وہ اصلاحی کلیسا کہلانے لگے، اور ان کے پیرووں کو پروٹسٹنٹ (احتجاجی) کہا جانے لگا، کیونکہ انھوں نے قدیم کلیسا کے خلاف احتجاج کر کے اپنی علیحدہ وحدت اور تنظیم قایم کر لی تھی، پروٹسٹنٹ اور اصلاحی کلیساؤں کا قیام سولہویں صدی کا ایک عظیم واقعہ ہے،

رومی کلیسا کے زوال کے اسباب

یہ احتجاج کلیسا کی صرف مذہبی تعلیمات اور عقاید کے خلاف نہیں تھا، بلکہ اس کے متعدد معاشی اور سیاسی اسباب بھی تھے، پندرہویں صدی میں عام طور پر جو ذہنی بیداری پیدا ہوئی تھی اس سے لوگوں کی آنکھیں کھلنے لگیں اور انھوں نے دیکھا کہ رومی کلیسا اور اس کے ماتحت ادارے ایثار اور خیر کے مراکز ہونے کے بجائے استحصال اور گمراہی کے اڈے بن گئے ہیں، اہل کلیسا بدعنوانیوں میں مبتلا تھے، پوپ اس کے کارڈینل اور اس کے اساقفہ امرا کی سی زندگی بسر کرتے تھے، عوام سے ان کا رابطہ بڑی حد تک ٹوٹ چکا تھا، اہل کلیسا قرون اولی کے عیسائیوں کی سادگی اور ایثار کو بھلا چکے تھے، انھوں نے حضرت عیسیٰ کی سیدھی سادی تعلیمات کے راستہ کو ترک کر دیا تھا، اور مذہب کو عوام کے لئے ایک دھوکہ کی ٹٹی بنا رکھا تھا، کلیسا کے

جاہ وحشم کی عمارت اس سرمایہ پر کھڑی کی گئی تھی، جو یورپ کے غریب اور محنت کش عوام سے کھینچا جاتا تھا،
کسان اور مزدور کا لہو اس کی تعمیر کا جزو اعظم تھا، یورپ کے مختلف ممالک سے روپیہ کھینچ کھینچ
کر روم جاتا تھا، اور وہاں عالیشان گرجاؤں کی تعمیر اور فنون لطیفہ کی سرپرستی میں صرف ہوتا تھا،
یہ بجائے خود اتنی بڑی چیز نہ سہی مگر مذہبی فرائض اور سماجی خدمات سے لاپروائی ایسے لوگوں کو
کھٹکنے لگی، جو اب نئی روشنی اور نئی تعلیم سے متاثر ہو چکے تھے، اس طبقہ نے محسوس کیا کہ مذہب کو
ایک ڈھکوسلہ بنا لیا گیا ہے، اس میں کسی معنویت، قلبی سکون اور روحانیت کا پتہ ڈھونڈے
سے نہیں ملتا، مذہب ایک بھول بھلیاں اور بے جان رسوم اور توہم پرستیوں کا ایک طلسم
تھا، عام آدمی نہ اسکو سمجھ سکتا تھا، اور نہ اس سے کوئی روحانی ادراک اور عرفان حاصل کر سکتا
تھا، چونکہ صدیوں سے وہ اس کا پیرو تھا، لہٰذا تکمیل رسم کے طور پر اب بھی اس سے وابستہ تھا،
اس کے شعور کی گہرائیوں میں فی نفسہ مذہب کی طرف ایک کشش ضرور موجود تھی، مگر مذہب کے
نام سے جو جنس اس وقت اس کے ہاتھ فروخت کی جا رہی تھی، اس کو وہ سمجھنے سے قاصر تھا، اور اس کی
جھوٹی ملمع کاری کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا،

کلیسا کی دولت پر قوم کی نظر

پاپائی نظام کو یہ ساری کمزوریاں گھن کی طرح کھا رہی تھیں، سولہویں
صدی میں کلیسا ایک انتہائی دولتمند ادارہ تھا، خانقاہوں اور کلیساؤں کے خزانے لبریز تھے،
یورپ کی ہزاروں بلکہ لاکھوں ایکڑ زمین کے اوقاف ان کے قبضہ میں تھے، اس دولت پر یورپ کے
بادشاہوں کی نئی نسل اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھی، اس سے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے، تاجر طبقہ بھی
اس مقصد میں، نئے بادشاہوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا، اس روپیہ سے وہ اپنی قومی اور
بین الاقوامی تجارت کو ترقی دے سکتا تھا، تجارت کے ذریعہ سے روپیہ بٹورنے کا اس صدی میں
جو نیا راستہ نکل آیا تھا، اس سے وہ کما حقہٗ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، ان کو بین الاقوامی تجارت کیلئے

بڑے بڑے جہازوں، بڑی بڑی کمپنیوں اور بڑے بڑے گوداموں کی ضرورت تھی، یہ سب اس کو حاصل
ہو سکتے تھے، بشرطیکہ کسی طرح وہ دولت جو مذہبی محاصل کے طور پر ملک کے باہر جاتی ہو ملک ہی
میں رہے، اور وہ دولت جو خانقاہوں اور کلیساؤں کے تہہ خانوں میں دبی پڑی ہے، اس کے ہاتھ
لگ جائے، یہ اسی وقت ہو سکتا تھا، جب کلیسا کو قومی حکومت کے زیر نگین کر لیا جائے، اور بیرونی
تسلط کی زنجیروں کو توڑ دیا جائے۔

نئی روشنی کی برکتیں

سولہویں صدی میں انگلستان، فرانس، جرمنی اور اسکینڈے نیویا میں ایک قومی خودداری
کا احساس بھی پیدا ہو گیا تھا، ان قوموں پر پاپائیت کی سیاست بہر حال بیرونی تھی، مذہب کے نام ہی سہی لیکن پھر بھی یہ ایک طرح کی غلامی تھی،
اور اس کا احساس ان کی قومی خودداری کی روح کو مجروح کر رہا تھا، شمالی اور مغربی یورپ کی قوموں
میں غیر شعوری طور پر ان خرابیوں کے خلاف ایک خاموش احتجاج کی اسپرٹ پرورش پا رہی تھی،
سولہویں صدی کا ذہن ازمنہ وسطیٰ کی پابندیوں، تنگ نظریوں اور تاریکیوں سے آزاد ہو چکا تھا،
علوم قدیمہ کی بازیابی اور نئی تعلیم نے دنیائے فکر و نظر میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی، عقل انسانی اُن
بلندیوں کو چھونے کی فکر کر رہی تھی، جہاں اب تک اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی، اس دور کے
علماء نے اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے عبرانی، یونانی اور لاطینی زبانوں کے قدیم ذخیروں کے کھنگالنے
میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، یورپ کے ہر ملک کو اس نئی روشنی کی برکتوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملا،
میکاولی اور 'ڈوالہ' اطالوی تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ فان ہٹن، جرمن نژاد، رابیلے فرانسیسی، ٹامس مور انگریز اور اراسمس ولندیزی تھا،
ان میں سے بعض تو اپنی روشن خیالی کے باوجود کلیسائے روما کے وفادار رہے اور بعض اس کو
شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور بعد میں انحراف کے راستہ پر چل پڑے، لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ
اصلاح مذہب کی تحریک کو محض نشاۃ ثانیہ نے جنم دیا تھا، اور نئی تعلیم پروٹسٹنٹ تحریک کا باعث ہوئی

یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے سے بالکل ممیز تھیں، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ نئی تعلیم کی وجہ سے بہت سے "اوہام" اور "رسوم" اور عقائد کی قلعی کھل گئی جن پر کلیسائے روما کو بہت اصرار تھا، اب اندھی تقلید کے دن گذر چکے تھے، انسانی ذہن "کیوں؟" اور "کس لیے؟" کے بہت سے سوالات سے بے چین تھا، جن سوالات کا شافی جواب نہیں ملتا، ان کو ماننے میں تامل ہوتا تھا، ایک عام آدمی بھی بشرط ذوق و استطاعت یونانی اور عبرانی زبانیں سیکھ سکتا اور جو علمی خزانے ان میں مدفون تھے، ان پر دسترس حاصل کرسکتا تھا، اب ولگیٹ[1] پر انحصار کی ضرورت نہیں تھی، انجیل کے اس سے زیادہ پرانے اور زیادہ مقدس نسخوں تک اسکی رسائی ہو سکتی تھی، ان کے ذریعہ سے حضرت عیسٰیؑ کی تعلیمات سے براہ راست واقفیت حاصل کی جا سکتی تھی، اب پوپ یا کلیسا کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں رہی تھی، یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ انسان اپنے ذاتی عمل اور وجدان سے خدا تک رسائی حاصل کرسکتا ہے،

مارٹن لوتھر سولھویں صدی میں مارٹن لوتھر (۱۵۴۱ - ۱۴۸۳) کے کلیسائے روما اور پاپائیت کے خلاف بغاوت کی، یہ جرمن نژاد تھا، اپنے احتجاج اور انحراف سے جرمنی میں اصلاح مذہب کا بانی ہوا، بائیس سال کی عمر میں "اگسٹینی درویشوں" کے گروہ میں داخل ہوگیا، اسی اثنا میں اسے ڈنبرگ کی یونیورسٹی میں "دینیات" کا پروفیسر مقرر کیا گیا، لوتھر علوم الہیہ کا ایک اچھا عالم ضرور تھا مگر اسے کوئی متجر عالم یا فلسفی سمجھنا غلطی ہوگی، اس میں کوئی جدت تھی اور نہ اپج، اس کی کامیابی کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنے عہد کا قابل ترین یا ذہین ترین آدمی تھا، بلکہ اس لئے کہ وہ جرمن قوم کا ایک سچا نمایندہ ثابت ہوا، جرمن کردار کی اس میں تمام خوبیاں بھی تھیں اور کمزوریاں بھی، وہ انتہائی جذباتی تھا اس میں ملاطفت بھی تھی اور تشدد بھی، وہ اپنے نفس کے محاسبہ میں آہن سے زیادہ سخت عجز و درماندگی میں ایک طفل معصوم سے زیادہ بے بس تھا، یہ اس کے احساس گناہ کی شدت کا

---

[1] بائبل کا ایک مستند نسخہ

نتیجہ تھا، اس میں تنگ نظری بھی پائی جاتی تھی، وہ انجیل کو سرمایۂ نجات اور مذہب کی حد تک لفظ آخر سمجھتا تھا، یہ بات اسکی سمجھ سے باہر تھی، کہ "مذہبی تخیل کی سرحدیں انجیل سے پرے بھی ہو سکتی ہیں، وہ اس تخیل میں کسی ارتقا کا قائل نہیں تھا، وہ سمجھتا تھا کہ کتاب مقدس" میں دنیا بھر کی دانائیوں اور خردمندیوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کے نزدیک اس کے باہر کسی سچائی کا وجود نہیں تھا، اس سچائی کی جانچ کے لیے وہ کسی آزادانہ تحقیق اور جستجو کا قائل نہیں تھا اس میں رواداری کی بو باس تک نہ تھی، اسی باعث یورپ کی آیندہ عقلیت پر مبنی لبرل تحریکات کا اس کو بانی نہیں سمجھا جاسکتا

یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جرمن قوم کلیسا کے خلاف کسی بغاوت اور انحراف کے لیے اس وقت بالکل تیار تھی یا اپنے لیے کوئی باغی کلیسا قائم کرنے پر تلی ہوئی تھی، واقعہ یہ ہے کہ اگر لوتھر ابتدأ الحدانہ خیالات کی ترویج کرتا تو وہ اول ہی میں اسے قوم مسترد کر دیتی، اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ صرف پاپائے روما کی جانب سے معافی ناموں کے اجرا کو ہدف ملامت بنانا شروع کیا، معافی ناموں کے عطیوں کو پوپ کی جماعت نے روپیہ کے حصول کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا، اور اس کو اتنی وسعت دیدی گئی تھی کہ یہ ایک مرض کی طرح کلیسا کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا، لوتھر نے جب اس برائی کے خلاف اپنی آواز اٹھائی تو اس کی صدائے بازگشت ان تمام گوشوں میں سنی گئی جہاں کلیسا کی بے لوثی اور پاکبازی کا خیال پایا جاتا تھا، اور کلیسائی زندگی کو بدعنوانیوں سے پاک کرنے کا جذبہ دلوں میں موجزن تھا، جرمنوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی، جو کلیسائی اخلاق کی اس ابتری اور زبوں حالی کا مشاہدہ بچشم نم کرتے تھے، مگر اتنی ہمت نہیں رکھتے تھے کہ کلیسائے روما کی بدعنوانیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کر سکیں، لیکن جب یہی صدائے احتجاج اس اگستینی درویش نے بلند کی تو بہت سے دردمند دلوں نے محسوس کیا کہ یہ اسکے دل کی آواز ہے،

معافی نامے یہ بات، پاپائے روم کو معافی ناموں کے عطا کرنے کا اختیار حاصل ہے ایک

نہایت ہی قدیم عقیدہ ہے، اس عقیدہ کے مطابق سینٹ پیٹر اور اس کے جانشین ایک لازوال "خزانہ تقدیس" کے مالک ہیں، یہ خزانہ حضرت عیسیٰؑ کی قربانی اور پشت با پشت کے مسیحیوں کی نیکیوں کی وجہ سے ہمیشہ بھرپور رہتا ہے، پاپائے روم سینٹ پیٹر کا جانشین ہونے کی وجہ سے اس خزانہ کا امین اور "ٹرسٹی" مانا جاتا تھا، مسیحیوں کے گناہوں کو معاف کرنے کے لئے وہ اسی لازوال خزانہ سے کام لیتا تھا، معافی نامہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جس کسی کو یہ عطا کیا گیا وہ گناہ سے پاک اور مبرا ہو گیا، بلکہ تصور یہ تھا کہ اس گناہ کے لیے جو سزا اُسے اگلی زندگی میں مل سکتی تھی اس سے وہ "کلیتہً" یا "جزواً" محفوظ ہو جائے گا، لیکن قدیم زمانے میں معافی نامے کے عطا کیے جانے کی ایک شرط یہ تھی کہ معافی کا طلب گار کامل عجز و اخلاص سے نہ صرف اعتراف گناہ کرے بلکہ گناہ سے تائب ہونے کا حتمی وعدہ اور مصمم ارادہ کرے، پروانہ معافی کے حاصل کرنے کے لئے اس کو ہدایت کیجاتی تھی کہ وہ مخصوص عبادات اور دعاؤں میں اپنے آپ کو مشغول رکھے یا مقامات مقدسہ کی زیارت کا قصد کرے یا نیک اور مذہبی کاموں میں چندہ عطا کرے، کلیسا کی اصطلاح میں ان فرائض کو نیکوکاری کا نام دیا جاتا تھا،

پاپائیت نے رفتہ رفتہ اس عقیدہ کا استحصال کرنا شروع کیا، اس کے اخلاقی انحطاط کے زمانے میں یہ صرف روپیہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا، اور معافی ناموں کے حصول کے لیے شرائط کی جو سختیاں تھیں انھیں یکسر بھلا دیا گیا، پوپ جولیس دوم اور پوپ لیو دہم روم میں ایک عظیم گرجا سینٹ پیٹر کے بنانے میں مصروف رہے، اس کے لیے ان کو روپیہ کی ضرورت تھی، چنانچہ دونوں نے بلا تخصیص پروانہ جات معافی اجرا کرنے شروع کیے، پوپ لیو نے تو اعلان کیا کہ وہ نہ صرف سزا میں تخفیف کا پروانہ دے سکتا ہے، بلکہ مناسب معاوضہ دینے والے کے گناہ کو ہی سرے سے مٹا سکتا ہے، اس نے ایک ڈومنیکی درویش

ٹٹزل (Tetzel) کو جرمنی روانہ کیا تاکہ سینٹ پیٹر کی تعمیر کے لیے عطیے حاصل کرے، ٹٹزل کی تقریروں سے جرمنی کے سنجیدہ اور ذی علم طبقہ میں موجودہ کلیسائی تنظیم کے خلاف سخت نفرت پیدا ہونے لگی، وہ عوام میں یہ کہتا پھرتا تھا کہ اگر اس نیک کام میں چندہ دیا جائے تو "نابرگ"[1] کی تمام پہاڑیاں خالص چاندی کی ہو جائیں گی اور یہ کہ کسی کے ایصال ثواب کے لیے کوئی رقم دی جائے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ادھر روپیہ پاپا کے خزانے میں داخل ہوا ادھر اس شخص کی روح جنت الماویٰ میں داخل ہو گئی، ٹٹزل کے ہاں مواعظ نے لوتھر کو غضبناک کر دیا، اس گمرہی کے خلاف اس نے پچانوے اعتراضات کی ایک فہرست تیار کی اور اس کو وٹن برگ کے کلیسا کے دروازے پر چسپاں کر دیا، جرمنی میں ان اعتراضات کا بہت اچھا خیر مقدم ہوا، ہر شخص اس کو اپنے دل کی آواز سمجھنے لگا، لوتھر اچانک ایک قومی ہیرو بن گیا، اس واقعہ کو جرمنی میں اصلاح مذہب کا قدم اولیں سمجھنا چاہیے،

لوتھر کا روحانی ارتقاء

لوتھر طبعاً ایک انتہائی مذہبی قسم کا آدمی تھا، وہ زہد و تقویٰ میں یکتا تھا، کوئی ریاضت ایسی نہیں تھی، جس کا وہ عامل نہیں رہا، وظائف، عبادات، فاقے، برت، نفس کشی، جسمانی اذیت ان سب کو وہ آزما چکا تھا، مگر اب تک نہ اس کا قلب منور ہوا تھا، اور نہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُسے روشنی کی کوئی کرن نظر آئی تھی، اس کے چاروں طرف تاریکی تھی، وہ اپنی نجات سے مایوس ہوتا جا رہا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ خدا تک اس کی رسائی ہو تو کیونکر ہو! ذات باری یکسر پاک اور منزہ تھی، دوسری طرف وہ اپنے کو ایک ایسا انسان سمجھتا تھا، جسکی سرشت ناپاک اور بدی سے معمور تھی اور گناہ اس کا ازلی ورثہ تھا، ان دونوں میں سنگم ہو تو کیسے ہو؟ وہ اس نور ازلی کا قرب حاصل کیسے کرے؟ اس کے لیے تڑپتا

[1] جرمنی کا ایک شہر جہاں اس وقت ٹٹزل مقیم تھا،

یاترا زیارت قبور، آثار متبرکہ کی پرستش اور کلیسا کی سائی ہوئی "نیکوکاریاں" یہ ساری چیزیں ہیچ، فضول بے معنی اور بے کار ثابت ہو رہی تھیں، اس مایوسی کے عالم میں یکایک اس پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا، جس گتھی کو سلجھانے کے لیۓ اس کی روح بے قرار تھی، وہ اچانک سلجھ گئی، اس پر یہ بات کھل گئی کہ نجات صرف ایمان ( ) کا ثمرہ ہے، جو دل ایمان سے خالی ہو نجات اسکے مقدر میں نہیں، نیکوکاریاں "لاکھوں سہی مگر ایمان مستحکم نہیں تو یہ سب بے کار ہیں، پھر انسان کے گناہ کی سیاہی صرف رحمت باری کی آغوش میں ڈھل سکتی ہے، اس رحمت لایزال پر کامل ایقان ہی "ایمان" کی اصل بنیاد ہے، اور یہی ایمان ابدی نجات کا واحد راستہ ہے،

لوتھر اپنے مذہبی افکار کے مختلف ارتقائی منازل سے ہو کر گزر رہا تھا، جب وہ اس عقیدہ پر پہونچا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، تو پھر دینی تصورات کی وہ عمارت جسے کلیسا نے کھڑا کیا تھا، اس کی نظر میں متزلزل ہونے لگی، اب کلیسائے روما پر اسے بھروسہ نہیں رہا، اس کی تعلیم کو وہ ایک ڈھکوسلہ سمجھنے لگا، روم کو وہ بابل اور سوڈام سے تشبیہ دیتا تھا، پوپ کو دجال کہتا تھا، کلیسائے روما سے متعلق اس کے ذہن کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے پادریوں کی شادی کی حمایت کی اور طلاق کے دینی جواز کا اعلان کیا، جب بات یہاں تک پہونچی تو کلیسائے روما سے اس کی علیحدگی ناگزیر ہو گئی، وہ یہود ہم (Ledx) نے اس کو خارج از ملت کر دیا، جب پوپ کا یہ حکم اس کو ملا تو اس نے اس کو برسر عام جلا دیا،

لوتھر کی تعلیمات کو کچلنے کی کوشش

پوپ نے نہ صرف لوتھر کے اخراج کا حکمنامہ صادر کیا بلکہ شہنشاہ کو لکھا کہ اس کے کفر و الحاد کے فتنہ کو سختی سے کچل دیا جائے، تاکہ کلیسا اس کی شرانگیزیوں سے محفوظ رہے، شہنشاہ چارلس پنجم جس کے سر پر فوراً ہی روما کی مقدس شہنشاہیت کا تاج رکھا گیا تھا، اس زمانے میں رومی کلیسا کا سب سے بڑا حامی اور پشت پناہ تھا، ایسا معلوم ہوا کہ قدرت نے

اسے اس کام کے لیے خاص طور پر پیدا کیا تھا، جیسا کہ وہ ہاپسبرگ کے خاندان سے تھا، جو ہمیشہ کٹر رومن کیتھولک رہا، وہ اسپین کا بادشاہ بھی تھا، اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اپنے دادا ( ) کے انتقال کے بعد وہ شہنشاہ منتخب کر لیا گیا تھا، ان رشتوں اور واسطوں سے قدرتی طور پر وہ کلیسائے روما سے ایسا وابستہ ہو گیا تھا کہ وہ عمر بھر اس کے تحفظ اور اس کی عظمت کے لیے شمشیر بکف رہا، اس کے کچھ سیاسی اغراض بھی تھے، کیونکہ رومن کیتھولک مذہب کا فروغ بہت کچھ سیاست سے بھی وابستہ تھا، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا، اس جوان شہنشاہ نے جو اس وقت مشکل سے ۲۰ سال کا تھا، کارزار حیات میں جب پہلا قدم رکھا تو اس کو سب سے پہلے لوتھر سے کفر و الحاد سے نمٹنا پڑا، یہ مقابلہ جب ایک مرتبہ شروع ہوا تو تمام یورپ اس لپیٹ میں آگیا، اور اس وقت تک ختم نہیں ہو جب تک پورا بر اعظم دو مخالف اور متحارب کیمپوں میں منقسم نہیں ہو گیا،

چارلس نے ورمس کے مقام پر اپنی پارلیمنٹ طلب کی اور وہ خود اس کا صدر نشین تھا، لوتھر کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پارلیمنٹ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے معتقدات کو بیان کرے مقصد یہ تھا کہ جبر و تخویف کے ذریعہ سے اسے اس کے معتقدات سے روگردان ہونے پر مجبور کیا جائے، مگر یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی، لوتھر اپنے عقائد پر چٹان کی طرح اٹل رہا، اس نے اپنے معتقدات بدلنے یا ان سے روگردان ہونے سے انکار کر دیا، اس نے اسوقت جو ہمت دکھائی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس وقت جرمنی میں اسے کم و بیش ملک گیر تائید حاصل تھی، اور وہ یہ جانتا تھا کہ بعض ریاستوں کے حکمراں اسے پوپ اور شہنشاہ کے امکانی حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں، لوتھر کے انکار پر ورمس کی پارلیمنٹ نے اسے باغی قرار دیا، ہر چند پوپ اور شہنشاہ اس کی تعلیمات کو مٹانے کے درپے تھے، مگر ورمس کا فیصلہ روز اول سے ہی ناکام ثابت ہوا،

لوتھر کی خوش نصیبی تھی کہ حالات اس کو بہت سازگار ملے، اس وقت تین بڑی طاقتیں

اس کی سرکوبی کر سکتی تھیں، ایک روما کی شہنشاہیت دوسرے آسٹریا تیسرے فرانس، یہ تینوں کٹر رومن کیتھولک طاقتیں تھیں، اگر یہ متحد ہو کر لوتھر پر ہلہ بول دیتیں تو تعجب نہیں کہ اس کی تحریک کا بھی وہی حشر ہوتا جو وکلف اور ہس کی تحریکوں کا ہوا تھا، مگر شہنشاہ کی سلطنت کی وسعت اس کی کمزوری کا سب سے بڑا باعث تھی، اسے اتنی فرصت کہاں تھی کہ جرمنی میں قیام کر کے لوتھر کے اس فتنہ کا تدارک کرتا، اس کی سلطنت کے سینکڑوں مسائل اس کی توجہ اپنی جانب کھینچے رہتے تھے، اس کا بھائی فرڈیننڈ آسٹریا میں اس سے زیادہ بے بس تھا، یہاں ترکوں کا خطرہ اسکے سر پر کچھ ایسا مسلط تھا کہ وہ لوتھر کے لیے کوئی وقت نکال نہ سکتا تھا، فرانس کے رومن کیتھولک ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا، اور روما سے وفاداری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھا، لیکن اس مسئلہ کو اس نے شہنشاہ کے خلاف اپنا سیاسی حربہ بنا لیا، جرمنی میں لوتھر کی تحریک کو زندہ رکھ کر فرانسیسی رہین اور شہنشاہیت دونوں کو کمزور کرنا چاہتے تھے، ہاپسبرگ خاندان کی تباہی میں فرانس کی کامیابی مضمر تھی، لہٰذا لوتھر کو فرانس کی جانب سے کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا بلکہ حق تو یہ ہے، کہ فرانس کی تائید نے لوتھر کے مذہب کو یورپ میں کامیاب بنایا،

لوتھر کے لیے جرمنی میں تائید لوتھر کی خوش قسمتی صرف یہی نہیں تھی کہ اس کے دشمن اس وقت کمزور اور غیر متحد تھے بلکہ بعض گوشوں سے اس کی تحریک کا خیر مقدم بڑی گرم جوشی سے کیا گیا، یوں تو جرمنی کا متوسط طبقہ تاجر امراء اور حکمران شروع سے ہی اس کے موافق تھے مگر سکسینی کے حکمران الکٹر نے اس کی بہت مدد کی، جس کو اس نئی تحریک سے بہت دلچسپی تھی، اس نے لوتھر کو اپنی ریاست میں جائے پناہ دی اور اس کی انتہائی آزمائش کے زمانے میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑا پوپ یا شہنشاہ دونوں اس کی تائید کی وجہ سے لوتھر پر دست تعدی دراز نہ کر سکے، سکسینی کا یہ بوڑھا حکمراں، الکٹر اس زمانے کا روشن خیال اور امن پسند حکمران تھا، اس کو اپنی چھوٹی سی

ریاست اس کے مضبوط قلعوں اور اس کی اپنی قائم کردہ وٹن برگ یونیورسٹی پر بہت ناز تھا، جس زمانے میں پوپ اور شہنشاہ، لوتھر کو پسپا کرنے کی فکر میں تھے، وہ اس بوڑھے الکٹر کے ایک مضبوط پہاڑی قلعہ میں بیٹھا اپنی تحریروں سے پاپائی معتقدات کے نظام کی دھجیاں ادھیڑنے میں مصروف تھا، اس کے مذہبی نظریات اور معتقدات نے اسی زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کی، اور ایک نئے کلیسا کو جنم دیا جو عام طور پر "لوتھرین کلیسا" کے نام سے موسوم ہے، فریڈرک کی مدد سے لوتھر کو شخصی تحفظ حاصل ہوا لیکن اس کے مذہب کی ترویج اور اشاعت وٹن برگ کی یونیورسٹی کی وجہ سے ہوئی، یہ یونیورسٹی لوتھر کے خیالات کی ترویج کا ایک بڑا مرکز بن گئی، یہاں سے کتابیں پمفلٹ اور رسالے چھپ چھپ کر جرمنی کے دور دراز گوشوں تک پہونچتے رہے، اور عوام میں مذہب اور کلیسا سے متعلق ایک نئی بیداری پیدا کی، اس نئے مذہب کی ترویج اور اسکو مقبول بنانے میں فلپ میلنکٹن کا بھی بہت بڑا حصہ ہے، یہ یونانی زبان کا ایک عالم متبحر مانا جاتا تھا، اس نے پروٹسٹنٹ تحریک کی بڑی زبردست خدمت انجام دی، اس نے پہلی مرتبہ ایک ایسی کتاب لکھی[۱] جس میں صاف اور سلیس زبان میں اس نئے "دین" کو پیش کیا گیا تھا، لوتھر کے پروٹسٹنٹ کلیسا کے لیے اس نے ایسے دینی اصول منضبط کیے جن کی بنیاد کلیتہً انجیل مقدس پر رکھی گئی تھی، ان سازگار حالات کے قطع نظر لوتھر کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہ بھی تھا کہ اس نے جرمن زبان کو اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے استعمال کیا، اس کی وجہ سے اس کا پیام گلی گلی اور کوچہ کوچہ پہونچا، یورپ کی کلیسائی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے، ورنہ صدیوں سے اہل یورپ صرف لاطینی زبان کے ذریعہ ہی سے اپنے مذہب تک رسائی حاصل کر سکتے تھے، اور جو لاطینی زبان سے بے بہرہ تھے، مذہب ان کے لیے ایک چیستان تھا، ان کے نفس اور ان کی روح کو براہ راست مذہب سے مربوط

---

[۱] اس کا نام "Loci Cmmunes" تھا

کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی، لوتھر اور اس کے ساتھیوں نے جرمن زبان کو استعمال کرکے اہل جرمن کے قلوب تک رسائی حاصل کرلی یہ تحریک ابتدائی زمانے میں جس قوت سے اٹھی اور جس گرم ..... جوشی سے اس کا ہر گوشہ سے خیر مقدم ہوا اس سے بظاہر یہ توقع پیدا ہوگئی تھی کہ پورا جرمن اس نئے مذہب کو قبول کریگا، اور یہ مذہبی اتحاد آیندہ جرمن قوم کو متحد کرنے کا باعث ہوگا، مگر یہ توقعات بہت جلد خاک میں مل گئیں، لوتھر کی تحریک میں بعض کمزوریاں بھی تھیں، جو بعد میں اس کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئیں،

اس تحریک کی کمزوریاں — لوتھر کے تشدد کی وجہ سے ان کی تحریک بعض حلقوں میں مشتبہ نظروں سے دیکھی جانے لگی، ایسے وسیع المشرب علماء اور دانشور جو ابتداً اسکی تحریک کے حامی تھے رفتہ رفتہ اس سے روگرداں ہوگئے، جنوبی ریاستوں میں خصوصاً اس کے خلاف ناراضگی کی ایک لہر پیدا ہوگئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تحریک کو پوری قوم کی پشت پناہی حاصل نہ ہوسکی اور اس کی تحریک نے اپنا قومی اور عوامی کردار کھودیا۔ ۱۵۲۵ء تک جرمن قوم اس مسئلہ پر دو حصوں میں بٹ گئی، شمالی ریاستیں لوتھر سے وابستہ رہیں اور انھوں نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرلیا، مگر جنوبی ریاستیں اپنے آبائی مذہب پر برقرار رہیں، مذہبی بنیاد پر جرمنی کی اس تقسیم نے اس کو ایک طویل اور خونین کشمکش کی رزمگاہ بنا دیا۔ ۱۵۲۴ء میں ریٹسبان کے مقام پر کیتھولک ریاستوں نے اپنی ایک لیگ قائم کرلی، اس کے جواب میں پروٹسٹنٹ ریاستوں کا اتحاد "ٹارگو" کے مقام پر ۱۵۲۶ء میں عمل میں آیا، اس کی مزید توسیع اسمال کالڈن میں ۱۵۳۱ء میں ہوئی، اس طرح لوتھر کی تحریک سے جرمنی دو مخالف اور مسلح کیمپوں میں منقسم ہوگیا، جرمنی میں انتشار اور لامرکزیت کی قوتیں پہلے سے کچھ کم نہیں تھیں، لوتھر کی تحریک نے اس تفریق اور انتشار کو تیز تر کردیا،

کسانوں کی بغاوت — اسی اثناء میں جنوبی ریاستوں میں ایک عظیم بغاوت پھوٹ پڑی، یہ

کسانوں کی بغاوت کہلاتی ہے، جرمنی میں کسانوں کی حالت نہایت ابتر تھی صدیوں سے ان کا استحصال کیا جارہا تھا ...... لوتھر نے جب کلیسا کی بدعنوانیوں کا پول کھولنا شروع کیا تو ان کسانوں کو امید کی ایک کرن سی نظر آنے لگی، کلیسا کے ماتحت جو زمینیں تھیں ان پر کام کرنے والے کسانوں کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں تھی، یہاں بھی وہی جبر و ظلم تھا، جو امراء سے وابستہ کسانوں پر روا رکھا جاتا تھا، لوتھر نے جب یہ کہا کہ کلیسا کی تمام جائیداد کو چھین لینا چاہئے کہ پوری قوم اس جائداد کی وارث ہو تو کسانوں نے اسے کان دھر کر سنا، وہ نہ صرف اپنے کلیسائی آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ امراء اور جاگیرداروں کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا، جنوبی علاقہ میں یہ ایک ملک گیر بغاوت بن گئی، نظم و ضبط کا سارا شیرازہ بکھرنے لگا، کسانوں نے اپنے چند بنیادی مطالبات پیش کئے تھے، وہ بیگار سے نجات اور اپنے آقاؤں کے جبر و ظلم سے چھٹکارا چاہتے تھے، اور معاشی اعتبار سے اپنی محنت کا معاوضہ مانگا کہ وہ سکون اور عزت کی زندگی بسر کرسکیں، مگر جب ایک مرتبہ بغاوت پھوٹ پڑی تو تشدد اور قانون شکنی کی وبا عام ہوگئی، ایسا معلوم ہونے لگا کہ بدامنی پورے ملک میں پھیل جائے گی، ایسے موقع پر لوتھر نے کسانوں کی سخت مخالفت کی، وہ نراج، بدنظمی اور لاقانونیت کو ہوا دینے کے لیے تیار نہیں تھا، اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ نراج کے اس طوفان خیز سمندر میں اس کی اصلاحی تحریک کی کشتی غرق ہوکر رہ جائے گی، اس لیے اس نے امراء اور جاگیرداروں کو کھلی چھوٹ دیدی کہ کسانوں کو جس طرح بنے کچل کر رکھ دیا جائے، ..... اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بڑے تشدد سے کام لیا گیا، بڑی خونریزی ہوئی اور جگہ جگہ وحشتناک بربریت کے واقعات پیش آئے، جرمنی کو اس جنگ نے نیم جان کردیا، کسانوں کی تباہی کا تو کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اس بغاوت میں وہ بالکل پس گئے، اور ان کی حالت پہلے سے زیادہ بدتر ہوگئی، لوتھر کی تحریک پر اس بغاوت کے بڑے گہرے اثرات پڑے کسان اس کے بدترین دشمن ہوگئے، ان کی نظر میں وہ ایک جھوٹا اور فریبی مصلح تھا، کسان اور نچلے طبقات اس سے بدظن ہوئے، امراء اور جاگیردار بھی اس سے

منہ موڑنے لگے، انھوں نے محسوس کیا کہ اسی کی تعلیم کی وجہ سے ملک کو اس خونریزی سے گذرنا پڑا، ڈ لوتھر کی تحریک کو بغاوت اور سرکشی کا سرچشمہ سمجھنے لگے، اور اس سے دور رہنے ہی میں اپنی عافیت دیکھی چنانچہ جنوبی ریاستوں کے امیر حکمران، مزدور دکسان سب ہی لوتھر سے متنفر او بیزار ہوگئے، اس طرح جنوب میں اصلاحی تحریک کا نام ونشان مٹ گیا، پاپائیت اور کلیسائے روما کا دوبارہ تسلط قائم ہوگیا،

جرمنی میں لوتھر کو جو ناکامی ہوئی اس کی تلافی کسی حد تک اسکینڈے نیویا کے ممالک میں ہوئی چند برسوں میں ڈنمارک اور ناروے کی متحدہ مملکت اور سویڈن میں رفتہ رفتہ لوتھر کے پروٹسٹنٹ کلیسا کو قبول کر لیا گیا، اور شمالی یورپ کے ممالک اس نئے پروٹسٹنٹ مذہب کے پُرجوش حامی اور رہبر دین گئے، سولہویں صدی کے اختتام تک شمالی جرمنی، ڈنمارک، ناروے، اور سوئیڈن میں لوتھر کا پروٹسٹنٹ مذہب پورے طور پر چھا گیا تھا،

کلیسا میں مفاہمت کی ناکام کوشش

ورمس کے فیصلہ کے بعد کا زمانہ جرمنی کے لیے بڑی آزمائش اور ابتلا کا تھا، تقریباً بیس سال تک پوری قوم آپس میں ایک مذہبی تصادم سے دوچار رہی، بہت سے مخلص اور دردمند لوگ دل سے یہ چاہتے تھے کہ اختلاف وافتراق کے بجائے کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے کلیسا کی اندرونی خرابیاں بھی دور ہوجائیں اور اس کا اتحاد بھی برقرار رہے، شہنشاہ چارلس پنجم بھی ان لوگوں میں سے تھا، جو سمجھوتے اور مفاہمت کے ذریعہ سے مذہبی امن کی بحالی کے خواہاں تھے، اس معاملہ میں اس کی نیک نیتی اور دردمندی میں کوئی شبہ نہیں، مگر شہنشاہ کو اتنی فرصت ہی نصیب نہ تھی کہ جرمنی کے اس مذہبی خلفشار کا کوئی مداوا دریافت کر سکتا، اپنی وسیع و عریض سلطنت کے مسائل میں صبح و شام مشغول رہتا، اسپین، افریقہ، اطالیہ اور ہندرلینڈس میں اسکو ایسی مشکلات درپیش تھیں کہ وہ ان سے غافل نہیں رہ سکتا تھا، ان وسیع ذمہ داریوں نے اُسے ایسا مصروف رکھا کہ ورمس کے فیصلہ کے بعد کم و بیش دس سال تک وہ جرمنی میں قدم نہیں رکھ سکا، ۱۵۳۰ء میں اگسبرگ کے مقام پر اس نے پھر ایک پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کیا، اس اجلاس میں یہ کوشش کی گئی کہ مفاہمت یا سمجھوتہ کا کوئی راستہ نکالا جائے، اس موقعہ پر پروٹسٹنٹوں نے اپنے عقائد کو ایک جامع اور واضح شکل میں پیش کیا، ان عقائد کو میلنکتھن جیسے متبحر اور صلح پسند عالم نے مرتب کیا تھا، لوتھر کے جدید کلیسا کے یہ اقل ترین مطالبات تھے ان سے کم کسی بنیاد پر وہ فریق مقابل سے صلح کرنا نہیں چاہتے تھے، میلنکتھن نے اس موقعہ پر پروٹسٹنٹ عقائد کو جو معین و منضبط شکل دی تھی ان کو "اگسبرگ کے اعترافات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور یہی عقاید بعد میں لوتھر کے کلیسا کے بنیادی عقائد بن گئے،

رومن کیتھولکوں نے ان کو سرے سے مسترد کر دیا، دونوں فریقوں میں نہ صرف خلیج باقی رہی بلکہ اور وسیع تر ہو گئی، شہنشاہ ان حالات میں بے بس تھا، اگسبرگ کی یہ مجلس مشاورت ناکام رہی ۱۵۴۱ء میں نو سال کے وقفہ کے بعد جب وہ پھر جرمنی آیا تو اس وقت تک حالات اتنے بدل چکے تھے کہ مفاہمت اور سمجھوتہ کی کوئی امید نہ تھی، شمالی جرمنی کی تمام ریاستیں لوتھر کے مذہب کو قبول کر چکی تھیں اور اس موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھیں، جب مفاہمت ناکام ہوتی نظر آئی تو پروٹسٹنٹ کلیسا کو مٹانے کی صرف ایک صورت باقی رہ گئی تھی، وہ یہ کہ اس کے خلاف طاقت استعمال کی جائے اگرچہ اسمال کالڈن لیگ کے قیام کے بعد سے بہت سی شمالی ریاستیں لوتھر کے مذہب کو قبول کر چکی تھیں، مگر پھر بھی کیتھولک طاقتوں کے مقابلہ میں وہ ایک پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں جرمنی کی لوتھرین ریاستوں کے خلاف رومن کیتھولک کی صف آرائی، پروٹسٹنٹوں کے لئے کافی مرعوب کن تھی، انھیں نہ صرف جنوب کی رومن کیتھولک ریاستوں کی جانب سے خطرہ تھا، بلکہ یورپ کی تمام بڑی طاقتیں رومن کیتھولک تھیں، اور اسکی حمایت میں، اگر یہ سب متحد ہوجائیں تو جرمنی کے پروٹسٹنٹ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اسپین، آسٹریا، اطالیہ، فرانس اور ہندرلینڈس کی طاقتیں اگر پروٹسٹنٹ مذہب کے مٹانے کے درپے ہو جاتیں تو شاید اس تحریک کا نام و نشان ہی مٹ جاتا، مگر ایسا اتحاد کبھی قائم نہ ہو سکا۔

مذہب اور سیاست

جرمنی میں اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا، وہ مذہب کی آڑ میں سیاست کا بھی تھا، بادی النظر میں

یہ توقع کی جاتی تھی کہ مشترکہ مذہبی وفاداریوں کی بنا پر جرمنی کے رومن کیتھولک والیان ریاست اور شہنشاہ کے درمیان کامل ہم آہنگی اور اتحاد خیال ہوگا، مگر صورت حال بالکل اس کے برعکس تھی مذہبی یکرنگی کے باوجود سیاسی سطح پر وہ شہنشاہ کے ساتھ تعاون کے لیے تیار نہیں تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ شہنشاہ جرمن میں زیادہ طاقتور ہو جائے، یا ایک مضبوط مرکزی حکومت شہنشاہ کی سرکردگی میں قائم ہو، وہ شہنشاہیت کی کمزوری کو پسند کرتے کیونکہ وہی ان کی آزادی اور خود مختاری کی ضامن ہوتی جرمن کے اتحاد اور رومن کیتھولک مذہب کی کامرانی سے زیادہ ان کو اپنی آزادی پیاری تھی، پروٹسٹنٹ اور کیتھولک سب ہی حکمران شہنشاہ کو مشتبہ نگاہ سے دیکھتے تھے، انکو ڈر تھا کہ کہیں وہ مرکز کو طاقتور کر کے انکی آزادی اور خود مختاری کا خاتمہ نہ کر دے، کیتھولک اس سے اس لئے بھی خوش نہ تھے کہ وہ کلیسا کی اندرونی بدعنوانیوں کو دور کرنا چاہتا تھا، لوتھر کے پیرو اس کے اس لئے مخالف تھے کہ وہ پاپاے روما کی سیادت کو تسلیم کرتا تھا، غرض ان مختلف اور متضاد قوتوں کی کشمکش میں جرمنی اور شہنشاہیت روما کا شیرازہ بکھرتا ہی رہا، چارلس پنجم جرمنی سے باہر سب کچھ تھا، اسپین، سدرلینڈس میں اطالیہ اور نئی دنیا میں ایک طاقتور حکمران اور عظیم شخصیت سمجھا جاتا تھا لیکن جرمنی میں وہ یہاں کا شہنشاہ کہلاتا تھا مگر فی الحقیقت اُسکی حیثیت ایک شاہ شطرنج کی سی تھی، اس نے بہت کوشش کی کہ "مقدس شہنشاہیت روما" جن متضاد اور پیچیدہ مسائل کی شکار تھی ان کا کوئی اچھا حل ڈھونڈھ نکالے مگر اسکی کوشش بار آور نہیں ہوئی، وہ اگرچہ کٹر رومن کیتھولک تھا اور اس مذہب کا یورپ میں بول بالا چاہتا تھا، مگر پاپائیت کی سربلندی کا دل سے خواہشمند نہیں تھا، پوپ سے اس کے اختلافات بھی تھے، اور وہ سیاسی معاملات میں اُسے قابو میں رکھنا چاہتا تھا،

ان سیاسی مصالح کی وجہ سے وہ پروٹسٹنٹوں کے خلاف حتی الامکان کھلی اور شدید جارحیت سے ایک عرصہ تک گریزاں رہا، اس نے ۱۵۴۶ء تک اس نے جرمنی کے پروٹسٹنٹوں کے خلاف اپنی تلوار بے نیام نہیں کی لیکن جب کولون اور پلاٹینیٹ کی ریاستوں میں پروٹسٹنٹ مذہب کو فروغ حاصل ہونے لگا تو اس نے اس کو کچلنے کے لیے جنگ کی تیاری کی، اور سب سے پہلے سیکسنی اور ہس کے حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہوا لیکن اس جنگ کو

مذہبی رنگ نہیں دیا بلکہ ان ریاستوں کے حکمرانوں کی سیاسی سرکوبی کو جنگ کا بہانہ بنایا، وہ جانتا تھا کہ جرمنی میں پروٹسٹنٹوں کے خلاف ایک کھلی مذہبی جنگ کامیاب نہ ہو سکے گی، ایک طرف تو اسمال کالڈن لیگ کی مسلح نبرد آزمائی کی تیاریوں کا اسے علم تھا، دوسری طرف جرمنی کے پروٹسٹنٹوں کو یورپ میں جو تائید حاصل تھی وہ بھی اس کے سامنے تھی نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ یہ جنگ پروٹسٹنٹوں کے خلاف ایک جہاد کی حیثیت رکھتی تھی مگر یہ صرف کیتھولک کے بل بوتے پر نہیں لڑی گئی، شہنشاہ جس کفر و الحاد کو مٹانے کے لئے رزم آرا ہونا چاہتا تھا، خود اسی کے بعض گوشوں سے اسے مدد کی بھی توقع تھی، چنانچہ سیکسنی کے مارکیس[1] نے پروٹسٹنٹ ہوتے بھی اس جنگ میں شہنشاہ کا ساتھ دیا، اور اپنے ذاتی اغراض کے لئے پروٹسٹنٹ مفادات کو نظر انداز کیا، وہ فریڈرک کے بجائے خود سیکسنی کا رکیٹر بننا چاہتا تھا، اور شہنشاہ سے اس بارے میں وعدے بھی حاصل کر لئے تھے،

پروٹسٹنٹوں کے خلاف جنگ مارکیس کی غداری نے پروٹسٹنٹوں کے موقف کو نقصان پہونچایا ۱۵۴۷ء تک شہنشاہ کو پروٹسٹنٹ لیگ کے خلاف فیصلہ کن کامیابی حاصل ہو گئی، جان فریڈرک اور فلپ آف ہس دونوں گرفتار ہوئے لیکن شہنشاہ کی یہ کامیابی کچھ کام نہ آئی، وہ اس موقع پر جرمنی کی کمزور اور مفلوج شہنشاہیت کو ایک طاقتور سلطنت میں تبدیل کرنا چاہتا تھا، اور اس غرض کے لیے بعض تجاویز بھی پیش کیں مگر پروٹسٹنٹ اور کیتھولک حکمرانوں نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کیا، جرمنی کے انتشار اور طوائف الملوکی ہی میں انکی بے لگام آزادی کا راز پنہاں تھا، اور وہ مرکز کو طاقتور بنا کر اپنی اس آزادی سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں تھے،

جنگ کا دوسرا مرحلہ اسوقت شروع ہوا جب کہ جرمنی کے پروٹسٹنٹ جرنلوں نے ہنری دوم شاہ فرانس سے معاہدہ کر کے اسکی تائید حاصل کر لی ہنری دوم اس وقت تک اس خیال کا حامی ہو چکا تھا کہ فرانس کی توسیع اطالیہ کے بجائے دریائے رائن کے کنارے ہونی چاہیے، اس لیے وہ اس شرط پر پروٹسٹنٹوں کو مدد دینے کے لیے تیار ہو گیا کہ میٹز، ٹول اور وردن کے علاقے اس کے حوالے کر دیے جائیں اور ان علاقوں میں وہ شہنشاہیت روما کا نائب امپیریل تسلیم کیا جائے، چنانچہ ۱۵۵۲ء میں ایک معاہدہ طے پایا، جو معاہدہ شامبورڈ Chamford

[1] مارکیس ڈیوک آف سیکسنی، جان فریڈرک الیکٹر آف سیکسنی کا قریبی عزیز تھا

کے نام سے موسوم ہے الساس اور یورین میں فرانس کی مداخلت کا سلسلہ یہاں سے شروع ہوتا ہے فرانسیسی فوجوں نے اس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے پیش قدمی کی اور دوسری طرف ماریس نے جو اس عرصہ میں شہنشاہ سے ناراض ہوکر پروٹسٹنٹوں سے جا ملا تھا، انسبرک کے مقام پر شہنشاہ کو ایسی شکست دی کہ اس کے پاؤں اکھڑ گئے وہ بمشکل تمام اپنی جان بچاکر درہ برینر کے راستے جرمنی سے نکل بھاگا، اس ناکامی کے بعد جرمنی کی سیاست پر شہنشاہ کا کوئی اثر باقی نہیں رہا،

معاہدہ آگسبرگ (۱۵۵۵ء) چارلس پنجم اپنی نیک نیتی اور اخلاص کے باوجود جرمنی کے مذہبی خلفشار کا کوئی مداوا دریافت نہیں کرسکا، یہ بیکار آزمائی ۱۵۵۵ء تک جاری رہی، خون بہتا رہا، مذہب کے نام پر لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے، اس خانہ جنگی کا خاتمہ بالآخر فرڈنینڈ کے ہاتھوں عمل میں آیا جو شہنشاہ کا بھائی اور آسٹریا کا بادشاہ تھا، ہاپسبرگ خاندان کا یہ نہایت زیرک اور دانشمند حکمران تھا، اسی کے تدبر نے جرمنی کو آئندہ کم و بیش پچاس سال تک جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھا، شہنشاہ کی کوشش یہ تھی کہ مفاہمت کے ذریعہ سے مذہبی اتحاد پیدا کیا جائے، مگر یہ حکمت عملی کامیاب نہیں ہوسکی، فرڈنینڈ نے مذہبی تفریق کی حقیقت کو تسلیم کرلیا، معاہدہ آگسبرگ کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی کہ پروٹسٹنٹ کلیسا کے وجود کو تسلیم کرلیا جائے، کلیسائی اتحاد کے نصب العین سے دست برداری حاصل کرلی گئی، لوتھر کے کلیسا نے جرمنی میں قانونی طور پر ایک مستقل جگہ پیدا کرلی، باغی کلیسا اب ایک جائز کلیسا تسلیم کیا گیا، معاہدہ آگسبرگ ایک عہد آفرین فیصلہ تھا، اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد اس سے پیدا ہونے والے ذیلی مسائل کی یکسوئی آسان تھی، یہ طے کیا گیا کہ جرمنی کی ہر ریاست اپنے مذہب کے انتخاب میں آزاد ہوگی، مگر یہ آزادی عوام کو نہیں بلکہ حکمران کو عطا کی گئی، حکمران کا مذہب، ریاست کا سرکاری مذہب ہوگا، اس میں نہ شہنشاہ مداخلت کرے گا اور نہ پارلیمنٹ، اس تصفیہ نے جرمن قوم کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل کردی کہ وہ عرصہ دراز تک قومی اتحاد کی نعمت سے محروم ہوگئی، اس سے ضمنی طور پر فرانس کو بہت فائدہ ہوا، کیونکہ ایک متحد اور طاقتور جرمنی سے اسے جو خطرات لاحق ہوسکتے تھے ان کا کوئی امکان ہی

باقی نہیں رہا، اس معاہدہ کی رو سے یہ بھی طے کیا گیا کہ دینی امرا، اساقفہ اور پادری اگر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کریں تو انکو اپنی کلیسائی جائیداد سے دست بردار ہونا پڑیگا[۱]، اور یہ کہ اگر کسی ریاست کا حکمران اسقف یا صدر اسقف ہو تو وہ اپنی رعایا پر رومن کیتھولک مذہب پر زور مسلط نہ کرسکے گا،

معاہدہ آگسبرگ سے وقتی طور پر جنگ کی لعنت ختم ہوگئی، مگر اس کی بنیاد ترقی پسند تصورات پر نہیں رکھی گئی تھی، اس سے جرمنی یا یورپ میں ترقی پسندی کے رجحانات کو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوئی اور نہ اس سے مذہبی رواداری کی اسپرٹ پیدا ہوسکی، اس کے ذریعہ سے صرف لوتھر کے کلیسا کو تسلیم کیا گیا تھا، جنیوا اور زیورچ (ZURICH) میں جو پروٹسٹنٹ تحریکات جنم لے چکی تھیں انھیں اکثر نظر انداز کیا گیا، ان کو تسلیم کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، یورپ ابھی اس مقام تک نہیں پہونچا تھا، جہاں مذہبی امور کے بارے میں اختلاف و انحراف کے لیے بھی کوئی باعزت جگہ نکالی جاسکتی، معاہدہ آگسبرگ اپنی محدود خوبیوں کے باوجود عصری قدامت پسندی اور تنگ نظری کا آئینہ دار تھا،

---

[۱] لیکن اس کے ساتھ یہ بھی رعایت کیگئی تھی کہ جو اساقفہ ۱۵۵۲ء سے پہلے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرچکے تھے، وہ اپنی کلیسائی جائداد و ریاست، پر بحال رہیں گے،

اسلام اور مستشرقین

پر

دار المصنفین کا بین الاقوامی سیمنار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

معارف کے ذریعہ سے ہم اپنے ناظرین کو برابر مطلع کرتے رہے کہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ر فروری ۱۹۸۲ء کو دار المصنفین میں ایک بین الاقوامی سیمنار "اسلام اور مستشرقین" پر ہونے والا ہے، الحمد للہ کہ گذشتہ ماہ ان تاریخوں میں یہ بخیر و خوبی انجام پاگیا۔

اس کے شروع ہونے سے پہلے برابر یہ خیال رہا کہ اس دور افتادہ قصبہ میں بیرونی ممالک کے لوگوں کو آنے میں بڑی تکلیف ہوگی، اس لیے وہ یہاں نہ آسکیں گے، لیکن جب فضل خداوندی شامل حال ہو تو پھر ہر قسم کی رکاوٹ خود بخود دور ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اپنی توقع سے زیادہ مندوبین باہر سے پہونچے، قطر سے شیخ عبداللہ یوسف القرضاوی نے اپنی تشریف آوری سے اس اجتماع کو رونق بخشی، وہ قطر یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی فیکلٹی کے صدر اور مشہور مصنف ہیں، اور بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی فکر صحیح اور جذبۂ اسلامی کے لیے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، وقار اور متانت کے پیکر نظر آئے، ان کے ساتھ اس یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب اور ایک دوسرے استاذ علی محمد یوسف المحمدی تھے، رابطۂ اسلامیہ مکہ معظمہ کا بھی ایک وفد آیا، اس کی قیادت اس کے

ڈائرکٹر جنرل شیخ عبدالصبور مرزوق کر رہے تھے، جن کی جاذب اور متحرک شخصیت توجہ کی مرکز بنی رہی، ان کے ایک رفیق بہت ہی بے تکلفی سے انگریزی بولتے تھے، ابوظبی سے رئیس قسم الشریعۃ بکلیۃ الحقوق والشریعۃ بجامعۃ الامارات العربیۃ المتحدۃ استاذ محمود الطنطاوی اور دکتور تقی الدین الندوی المظاہری استاذ شعبۂ حدیث عین یونیورسٹی اور مشیر علمی اسلامی کورٹ آئے، مدینہ یونیورسٹی سے دینیات اور اسلامیات کے دو اساتذہ بھی شریک ہو کر اپنے ساتھ برکتیں لائے، ظہران یونیورسٹی سے ڈاکٹر ظفر اسحٰق، پروفیسر تاریخ اسلامی جامعۃ البترول والمعادن اپنی بیگم اور اپنی نیکی، بھلمنساہت اور شرافت اخلاق کے ساتھ آئے، بنکاک (تھائی لینڈ) سے جناب ابراہیم قریشی سکریٹری جمعیۃ الاسلام اپنے دو رفقاء رحیم شاہ اور سکندر خان کے ہمراہ عجز و انکسار کے تحفے لے کر آئے، جاپان سے عبدالکریم سائتو نے اس میں شرکت کر کے اسلام کی عالمگیر برادری کا ثبوت دیا، استاذی المحترم جناب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر سید سلمان ندوی ہمہ تن نیاز بن کر جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی سے پہونچے تو اپنے والد بزرگوار کی یادوں کی مشعل روشن کرتے رہے، کراچی سے حکیم محمد سعید دہلوی (ہمدرد فونڈیشن) اپنی بے داغ بلکہ بلوری شیشے سے زیادہ چمکدار سفید شیروانی میں دار المصنفین کے احاطہ میں داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ یہاں سہانی چاندنی چھٹک رہی ہے، ان کے ساتھ ڈاکٹر فریدالدین بقائی بھی تھے جو کراچی کے کامیاب ترین ڈاکٹروں میں ہیں، کراچی کے ان مہمانوں کی معیت میں حکیم نعیم الدین زبیری بھی تھے، اسلام آباد (پاکستان) سے وہاں کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ اپنے چھ رفقائے کار کے ساتھ آکر اپنے حسن خلق، پاکی طینت، عجز اور انکسار کے نقوش پیچھے چھوڑ گئے، ان کی معیت میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی بھی تھے جو بین الاقوامی المجمع الفقہی، رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے رکن اور موتمر اسلامی کے اعزازی ڈائرکٹر جنرل بھی ہیں، علمی، فقہی، ادبی اور دینی معلومات کے بحر ذخار ہیں، بولتے ہیں تو بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے ہیں، اس وفد میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بھی شریک تھے، جو اسلامک ریسرچ

انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر کے بہت ہی لائق مدیر ہیں، آج کل بڑی محنت بلکہ عرق ریزی سے مولانا حمید الدین فراہی کے قرآنی علوم پر کام کر رہے ہیں، اس علمی قافلہ کے ساتھ ڈاکٹر محمد طفیل ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ نے دار المصنفین آکر اس ادارہ اور میری حقیر ذات سے اپنے گہرے لگاؤ اور تعلق کا ثبوت دیا، جناب محمود احمد غازی ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کو دار المصنفین کے ذرہ ذرہ سے محبت نہیں بلکہ والہانہ عشق ہے، جس کا اظہار اسلام آباد سے اعظم گڈھ تک کی راہ نوردی میں کیا، اس علمی کاروان میں ڈاکٹر احمد خان لائبریرین اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کو دار المصنفین کی مطبوعات اور خصوصاً رسالۂ معارف سے ایسی غیر معمولی محبت ہے کہ یہاں کی تصانیف اور معارف کے مضامین کے اسمائے معرفہ کے اوپر جو ایک ہلکی سی لکیر بنادی جاتی تھی اور بعد میں ترک کر دی گئی تو اس سے ان کو دکھ ہوا، اور شکوہ سنج ہوئے کہ وہ اب کیوں نہیں ہوتی ہے، وہ تو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں، اسلام آباد سے اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مفتی سیاح الدین کاکا خیل بھی تشریف لائے اور اپنی قد آور شخصیت اور پاٹ دار آواز سے ہر جگہ چھائے رہے، لاہور سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مدیر جناب شیخ نذیر حسین سفر کی بڑی صعوبتیں برداشت کر کے دو روز دیر کر کے پہونچے، مگر دار المصنفین سے اپنی غیر معمولی محبت و عقیدت کے گلدستے نذر کر گئے،

ہندوستان سے جناب حکیم عبد الحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ دہلی) اپنی پوری عظمت اور سطوت کو اپنے جلو میں لے کر جناب اوصاف علی ڈائرکٹر انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر تغلق آباد کے ساتھ رونق افروز ہوئے، جناب حکیم صاحب ہماری مجلس انتظامیہ کے معزز رکن بھی ہیں، جناب اوصاف علی ان کے ساتھ آئے تو گویا انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر بھی کھنچ کر دار المصنفین چلا آیا تھا، دہلی سے مولانا مفتی عتیق الرحمن اپنی پیرانہ سالی اور کمزوری صحت کے باوجود دار المصنفین کی محبت میں سفر کی ساری مشکلات کو طے کر کے تشریف لائے، اور دکھ ہے کہ جب واپس ہو رہے تھے، تو بارہ بنکی کے پاس ریل ہی میں ان پر فالج کا اثر ہو گیا، یہ ہمارے سمینار کا ایک المناک پہلو ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو

جلد صحت کلی عطا فرمائے تاکہ وہ تا دیر قوم و ملت کی خدمت کر سکیں، دہلی ہی سے مولانا ابو اللیث ندوی امیر جماعت اسلامی نے تشریف لا کر اپنی اس محبت کا ثبوت دیا جو ان کے دل میں بچپن سے دار المصنفین کے لیے جاگزیں ہے، وہاں سے مولانا سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ فتحپوری بھی یہاں آئے تو ان کی دلکش اور رعنا شخصیت دیدہ زیب بنی رہی، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی بھی آئے، جو سمینار کے مرد میدان ہیں، اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (شعبۂ اردو) بھی یہاں آکر اس بزم میں شریک ہوئے، وہ اپنے مخصوص طرز نگارش سے ہر اس موضوع میں جان ڈال دیتے ہیں جس پر ان کا قلم چل نکلتا ہے، جامعہ ملیہ دہلی سے جناب ضیاء الحسن فاروقی، ڈاکٹر شبیر الحق ندوی، ڈاکٹر حافظ محمد شبیب، ڈاکٹر عماد الحسن فاروقی اور جناب عبد اللطیف اعظمی نے یہاں آکر اپنے اس دیرینہ تعلق کا ثبوت دیا جو ان کو اس ادارہ سے ہے، جناب ضیاء الحسن فاروقی، سید شہاب الدین دسنوی اور سعید انصاری صاحبان ہماری مجلس انتظامیہ کے ارکان میں سے ہیں، اس لیے یہ حضرات سمینار کے انتظام کے لیے کچھ دنوں پہلے آگئے تھے اور بڑی محنت سے ہر کام میں جناب عبد اللطیف اعظمی کے ساتھ رواں دواں رہے، جناب ضیاء الحسن فاروقی سمینار میں جب اپنے خوبصورت اور موثر انداز میں مقالہ پڑھتے ہیں تو حاضرین کو محظوظ کیے بغیر نہیں رہتے، ڈاکٹر شبیر الحق ندوی ابھی جوان ہیں، ان کی مقالہ نگاری میں جوانی کی ساری امنگیں اور ترنگیں ہوتی ہیں، ڈاکٹر عماد الحسن جناب ضیاء الحسن فاروقی کے فرزند ارجمند ہیں، خدا کرے ان کو اپنے والد بزرگوار کی ساری خوبیاں عطا ہوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب بھی تشریف لائے، اعظم گڈھ کے لوگوں اور خصوصاً مسلم یونیورسٹی کے یہاں کے اولڈ بوائز نے ان کی جس طرح پذیرائی کی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ نسیم نوبہاری بن کر آئے ہیں اور جب وہ واپس ہوئے تو لوگوں کی زبان پر تھا کہ اپنے اخلاق کے گل و صنوبر کا ایک گلشن آباد کر گئے ہیں، مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہاں آکر خاص طور سے

مجھ کو نوازا، وہ اس وقت تاریخ مشایخ چشت کا سلسلہ مرتب کرکے تصوف کے تخت طاؤس پر بیٹھ کر صاحب قرانی کر رہے ہیں۔

علی گڑھ ہی سے فاضل اجل جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی اڈیٹر برہان بھی تشریف لائے جو جہاں جاتے ہیں اپنے علم و فضل، قوت گویائی، یگانگت، موانست اور محبت کے شیش محل کی بنا ڈال دیتے ہیں۔

وہاں کے شعبۂ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال انصاری بھی آئے، جن کو سمینار کی تقریبوں کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کا بڑا ملکہ ہے، ان سے طے تھا کہ وہ یہاں آکر اس تقریب کو ہر طرح کامیاب بنانے میں مدد کریں گے، ان ہی کے شعبہ کے ریڈر ڈاکٹر اکمل ایوبی بھی آئے جو مختلف سمیناروں میں برابر بلائے جاتے ہیں، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر نہ آسکے تو ان کی نمایندگی اس شعبہ کے استاد جناب اجمل ایوب اصلاحی نے کی، جن کا تقرر مدینہ یونیورسٹی میں ہوچکا ہے اور وہ وہاں جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

میرٹھ سے جناب مولانا قاضی زین العابدین سجاد اپنے صاحبزادے زین الساجدین استاذ شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی کے ساتھ شریک ہوئے تو ان کی ہر گفت گو سے ان کے علم و فضل کا اظہار ہوتا تھا، لکھنؤ سے مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے دو داماد اور بھتیجے جناب حکیم عبد القوی دریابادی اڈیٹر "صدق جدید" اور جناب حبیب احمد قدوائی نے بھی آکر گویا اپنے فاضل اجل چچا مرحوم کی نمایندگی کی۔

لکھنؤ سے جناب علی جواد زیدی چیرمین اتر پردیش اردو اکیڈمی نے آکر مجھ کو خاص طور پر رہین منت کیا۔ یادش بخیر جناب خلیل الرب صاحب سابق ڈپٹی ڈائرکٹر اردو سیکشن یوپی گورنمنٹ پندرہ (۱۵) روز پہلے الہ آباد سے یہاں آگئے تھے، ان کو چمن بندی کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، یہاں کے پھولوں اور پودوں کو سجا کر اپنے حسن ذوق کا ثبوت دیا، پھر اس تقریب کے ہر کام کو ایسی دل سوزی سے انجام دینے کی

کوشش میں لگے رہے، جیسے یہ ان کا اپنا ادارہ ہے، کچھ دنوں پہلے وہ اعظم گڈھ میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں رہ چکے ہیں، اس لیے یہاں کے ہر طبقہ میں روشناس اور مقبول رہے، الہ آباد ہی سے وہاں کی یونیورسٹی کے استاذ جناب طفیل احمد مدنی نے بھی آکر شرکت کی، وہ اس موقع کے لیے ایک نظم بھی لکھ کر لائے تھے۔

بھوپال سے اپنی کرم گستری سے نواز کر کے حضرت سعید میاں سجادہ نشین خانقاہ یعقوبیہ مجددیہ سلسلہ کی تمام برکتیں ساتھ لے کر تشریف لائے، دہلی سے برادر عزیز جناب حافظ محمد عمران خان صاحب ندوی اپنے فرزند ڈاکٹر محمد حسان کو ساتھ لے کر پہونچے، انھوں نے کچھ دن پہلے اپنی ایک آنکھ کا آپریشن کرایا تھا، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے معزز ترین ارکین میں ہیں، دار المصنفین کی ہر قسم کی سرگرمیوں میں ساتھ رہے ہیں، اس اجتماع میں شریک ہونے کے لیے بے تاب تھے، اسی بے تابی میں اپنی آنکھوں کی تکلیف کی پروا کیے بغیر یہاں آکر ہماری ہمت افزائی اور دلجوئی کی، پٹنہ سے خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے بھی شرکت کی، جو سمینار میں اپنے سوالات سے ہلچل اور گرمی پیدا کر دیتے ہیں، دربھنگہ سے ڈاکٹر عبد العزیز سلفی دار المصنفین کی محبت میں کھنچ کر پہونچے، گیا سے عزیزی سید اشہد علی ایڈوکیٹ آئے تو اپنے والد مرحوم جناب سید ریاست علی ندوی سابق رفیق دار المصنفین کی یادوں کو تازہ کر گئے، اندور سے جناب عبد الحمید اور کالی کٹ سے ڈاکٹر سید قدرت اللہ بقائی صدر شعبۂ اردو فاروقی کالج دور دراز سفر کی زحمت گوارا کر کے اس اجتماع میں شریک ہوئے، کشمیر سے جناب عبد الرحمٰن کونڈو برفستانی راستے طے کر کے دار المصنفین کی محبت میں کشاں کشاں آئے، وہ اس ریاست کے صاحب ذوق اہل علم اور باہمت معاشرتی کارکن ہیں۔

بھڑوچ سے مولوی غلام محمد واسطی نے بھی آنے کی تکلیف گوارا کی، بمبئی سے مولانا محمد مستقیم ندوی قاسمی بھی دار المصنفین کی بے پناہ والہانہ محبت کے ساتھ آئے، ان کی معیت میں پندرہ (۱۵) آدمی اور تھے، بمبئی سے ہماری مجلس انتظامیہ کے رکن رکین سیٹھ عبد العزیز انصاری دس (۱۰) روز پہلے اعظم گڈھ تشریف لائے،

اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ مئو سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی تشریف نہیں لا سکے، کیونکہ ان ہی دنوں ان کو دل کا دورہ پڑا، جس سے ہم ان کی تشریف آوری کی برکت اور ان کی علمی فضیلت کی رونق سے محروم رہے۔ ملک کے مشہور عالم اور مصنف مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سیمینار سے پہلے برابر یہاں تشریف لا کر اپنے عالمانہ اور مخلصانہ مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد اس مذاکرہ میں شرکت کے لیے کیا بلکہ اس اہم موقع پر دارالمصنفین پر نچھاور ہونے کے لیے آئی، اس کے انعقاد سے دس روز پہلے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے محبوب بھانجے اور مولانا رابع ندوی کے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی کی وفات ہوگئی تو اس سے دارالمصنفین کے خدمت گذاروں پر بجلی گری، خیال ہوا کہ اس المناک حادثہ کے بعد اس مذاکرہ کو ملتوی کر دینا ہی بہتر ہوگا، مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا رابع ندوی دونوں نے اپنے بے مثال صبر وضبط سے کام لے کر ایسا ہونے نہیں دیا، اور ندوۃ العلماء کے پینتیس ۳۵ طلبہ کو ان کے استاد مولانا محمود الازہار، مولانا فاروق بھٹکلی، مولانا ابوسحبان کی نگرانی میں جلسہ گاہ کی زینت و آرائش کے لیے بھیجا، وہ آئے تو منددبین کے لیے خوبصورت اور دیدہ زیب فائل، مختلف قسم کے بیج، زیب وزینت کے سامان اور موقع کے لحاظ سے ہر قسم کے لٹریچر اور پمفلٹ اپنے ساتھ لائے، جن سے مذاکرہ میں وزن، وقار اور حسن بھی بڑھا، وہ منظر بھی عجیب وغریب تھا، جب یہ طلبہ اپنے سروں اور کاندھوں پر کرسیاں، میزیں، قالین اور فرش ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہوئے دکھائی دیتے، پھر اپنی محنت اور خوش سلیقگی سے جناب محمود الازہار کی ہدایت سے کھلے اجلاس کے پنڈال اور مجلس مذاکرہ کے اسٹیج کو جنت نگاہ بنا دیا، اور جب مولانا سعید الاعظمی، مولانا ابوالعرفان، مولانا مجیب الرحمٰن، مولانا شمس حق، مفتی محمد ظہور، مولانا محمد مرتضیٰ، مولوی سلمان اقتدار احمد اور مولوی محمد رضوان وغیرہ پہونچے تو گویا دارالعلوم ندوۃ العلماء دارالمصنفین کے احاطہ میں منتقل ہوگیا، ان تمام حضرات نے اپنی ہر امکانی کوشش سے

اس تقریب کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، مولانا سعید الاعظمی اور مولانا شمس حق تو کبھی جگنو، کبھی چھلاوہ اور کبھی برق جمال کی طرح چمکتے دکھائی دیتے۔

اس شہر میں قیامگاہ کی بڑی دقت تھی، یہاں اچھے ہوٹل نہیں، اس مجبوری کی وجہ سے مہمانوں کو ہوسٹل کالج کے خیموں میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا، ان خیموں کی فراہمی میں جناب اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس نے غیر معمولی مدد پہونچائی، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے اہم رکن بھی ہیں، وہ اگر لکھنؤ میں اپنے غیر معمولی اخلاق اور اخلاص سے اتنے اندازنہ ہوتے تو اتنے خیموں کا فراہم ہونا آسان نہ تھا، اس کے لیے ہم ان کے بہت ممنون ہیں، چالیس پچاس خیموں اور پنڈال وغیرہ کے لیے ایک بڑے میدان کی ضرورت تھی، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے سکریٹری جناب امتیاز احمد صاحب ایڈووکیٹ نے کالج کے میدان، اس کے کمرے، فرنیچر اور ہر چیز کو استعمال کرنے کی اجازت دے کر ارباب دارالمصنفین کو ممنون کیا، کالج کے پرنسپل جناب محمد محسن عثمانی اور ان کے پورے اسٹاف نے اس موقع پر جس طرح تعاون کیا اس کے لیے بھی ہم ان کے شکر گذار ہیں، کالج کے جناب محمد غوث عالم (وائس پرنسپل) جناب اشفاق احمد (پروکٹر) جناب حماد عباسی (شعبۂ انگریزی) جناب ڈاکٹر محمد عرفان (شعبۂ اردو) ڈاکٹر انصار بیگ (شعبۂ حیوانیات) جناب وسیم الحسن (شعبۂ نفسیات) جناب وسیم احمد (شعبۂ جغرافیہ) ڈاکٹر رحمت اللہ (شعبۂ ہندی) ڈاکٹر نیاز احمد (شعبۂ تعلیمات) ڈاکٹر محمد صفی، ڈاکٹر مسیح الرحمٰن (شعبۂ علم الکیمیا) جناب محمد مشتاق اور اظفر فیضان (شعبۂ ریاضیات) جناب مسعود حسن اور مختار احمد (شعبۂ تعلیمات) اور ڈاکٹر محمد جمال (شعبۂ نفسیات) اور غیر تدریسی اسٹاف میں نیاز احمد اور وددا احمد نے پوری تن دہی اور دل سوزی سے اس مذاکرہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، اسی طرح شبلی انٹر کالج کے سکریٹری جناب مرزا امتیاز احمد بیگ ایڈووکیٹ نے شروع ہی سے ہمارے ہر کام میں پورا تعاون کیا، اس کے پرنسپل جناب حکیم الدین اور وہاں کے اساتذہ میں ڈاکٹر نیاز داؤدی، جناب عشرت علی، محمد اجمل انصاری، حسن اعجاز،

محمد مسلم اور شاہد کلیم صاحبان بڑی محنت اور مشقت سے اس کے چھوٹے بڑے کاموں میں لگے رہے، خورد و نوش کے اہتمام کے ہیرو ڈاکٹر محمد طاہر (شعبۂ اردو شبلی کالج) رہے، جنھوں نے بہتر سے بہتر کھانے پکوا کر مہمانوں کے کام و دہن کی لذت کا سامان کیا، ان کی خوش سلیقگی کی داد تمام بیرونی مہمانوں نے بھی دی، ان کے چچا مولوی عبد الباقی اصلاحی کالج کے افضال احمد، شفقت علاء الدین اور اسکول کے جناب شاہد احمد خان نے ان کو ہر قسم کی مدد پہونچائی، شبلی کالج کے شعبۂ اردو کے طلبہ نے اس تقریب کو اپنی تقریب سمجھ کر اس کو کامیاب بنانے میں پوری جانفشانی کا ثبوت دیا، شبلی کالج کے ڈاکٹر قمر الدین (شعبۂ نباتیات) نے بڑی فراخ دلی سے اپنا پورا مکان مہمانوں کے قیام کے لیے پیش کیا، جس سے بڑی سہولت رہی۔

شہر کے معززین میں جناب امین الدین (سابق پروفیسر قانون شبلی کالج) جناب مبین الدین (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر) جناب امجد علی غزنوی وکیل (نائب صدر مجلس انتظامیہ شبلی کالج) جناب شاہ خالد وکیل، جناب محمد ایوب (بیمہ کمپنی) مولوی عزیز الرحمٰن (سابق استاذ شبلی اسکول) ڈاکٹر محمد سلیم ایم. ڈی شروع سے مفید مشورے دے کر حوصلہ افزائی کرتے رہے، شاہ خالد نے سمینار کی ابتدائی دو راتیں جاگ کر گذاریں، اظفر فیضان اور مشتاق احمد صاحبان (شعبۂ ریاضیات) سایہ کی طرح برابر ساتھ رہے۔

پھر ہماری مجلس انتظامیہ کے مقامی اراکین میں جناب مرزا امتیاز احمد بیگ وکیل اور جناب شوکت سلطان صاحب نے وہی سارے حقوق ادا کیے جو ان کو کرنا چاہیے تھے، جناب مرزا امتیاز احمد بیگ تو ہر موقع پر میرے دوش ناتواں کو سنبھال کر میرے دل کو اپنے ہاتھوں میں لیے رہے، جناب شوکت سلطان صاحب لکھنؤ کے سفر میں برابر ساتھ رہے، انھی کی مساعی جمیلہ سے یو. پی حکومت کے وزیر جناب عمار رضوی اس موقع کی علمی نمایش کے افتتاح کے لیے تشریف لائے، ان ہی کی سفارش پر تین دن بجلی کی روشنی کا اچھا انتظام رہا، اس کے لیے ہم مجلس قانون ساز کے پھولپور (اعظم گڈھ) حلقہ کے ممبر جناب ابو الکلام کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے لکھنؤ میں بیٹھ کر ہر قسم کی امداد کی۔

اعظم گڈھ کے جناب راجہ اعظم خاں کے پوتے نیر اعظم بھی سایہ بن کر ساتھ رہے، مہمانوں کے ٹرانسپورٹ کا بڑا اچھا انتظام کیا، انھوں نے اظفر فیضان کے ساتھ مل کر میونسپلٹی اور بجلی کے محکموں کی طرف سے صفائی ستھرائی اور روشنی کا خاطر خواہ انتظام کیا، اس کے لیے ہم ایگزیکیٹیو انجینیر بجلی چندکول اور سینیٹری انسپکٹر محمد صدیق ہاشمی کے بھی شکر گذار ہیں۔

ضلع کے حکام میں جناب کلکٹر اور کپتان صاحب نے بھی ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائیں، خیموں کے لیے محافظ دستے بھی بھیج کر ممنون کیا۔

دار المصنفین کے خدمت گذاروں نے تو اپنی جان کی بازی لگا دی تھی، ہر فرد متحرک تھا، اس کے رفقاء میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عبد الرحمٰن پرواز، حافظ منصور نعمانی، حافظ محمد عمیر اور کتب خانہ کے مولوی عبد الباری اور محمد اسحٰق ادیب نے مل کر بہت ہی عمدہ علمی نمایش سجائی تھی، جو مہمانوں کے لیے بہترین علمی اور ثقافتی ضیافت ثابت ہوئی، ان کی مدد کے لیے جناب الحاج مولوی ابو البقاء ندوی مدعو کر لیے گئے تھے، وہ پہلے دار المصنفین ہی سے منسلک تھے، اب مبارکپور میں طبابت کرتے ہیں، وہ تقریباً پندرہ روز پہلے آگئے تھے، اپنی ان تھک محنت اور ہر کام کو انجام دینے کی صلاحیت سے ہر کس و ناکس کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، جو کام مشکل نظر آتا، اس کو وہ بہت ہی خندہ پیشانی سے انجام دے دیتے، اس موقع پر خاص طور سے مولوی احتشام علی ندوی بلا لیے گئے تھے، جو پہلے ہمارے دفتر میں رہ چکے ہیں، انھوں نے اخراجات کے حساب کتاب اور دوسرے مالی امور میں دفتر کے خزانچی مشہود اویس کی بڑی مدد کی، اور دوسرے انتظامی کاموں کو بھی سلیقہ سے انجام دیتے رہے۔ ہمارے رفیق کار جناب محمد مجید زبیری صاحب اپنی علالت کے باوجود سارے انتظامی امور کے بار کو عمدگی سے سنبھالتے رہے، پریس کے عملہ میں منشی محمد اقبال، محمد انوار خان اور مولوی ابو الحسنات نے اس موقع پر اپنی خطاطی کے اچھے نمونے پیش کیے۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی کا پروگرام تھا کہ وہ سمینار کے شروع ہونے سے تین روز پہلے ہی تشریف

لائیں گے، مگر اپنے عزیز بھانجے کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے ۲۰ فروری کی شام گذار کر رات کو مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء، اور مولانا محمد رابع ندوی کے ساتھ دارالمصنفین میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ سیمنار کی تقریب کے جسم میں ایک سحر آفریں اور عطر آگیں روح منتقل ہو گئی ہے، پورا احاطہ روشنی سے ضرور جگمگا رہا تھا، لیکن ان کی تشریف آوری سے علم و فن کی کرنیں ہر طرف پھوٹتی نظر آنے لگیں، مولانا رابع ندوی کا دل اپنے عزیز بھائی کی دائمی جدائی سے سوگوار اور رنجیدہ ضرور تھا، مگر وہ اپنے پریم بیتی کے ساتھ آئے اور زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ یہ مذاکرہ کامیاب ہو کر رہے گا، ان حضرات کے آنے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا کہ میرے جسم کے اندر ایک بہت ہی طاقتور ڈائنمو نصب کر دیا گیا ہے، پھر تو ہر قسم کی حرکت اور سرگرمی میرا ساتھ دے رہی تھی۔

۲۱ فروری کو تقریباً دس بجے دن کو ایک مرصع پنڈال میں مذاکرہ کا افتتاح ہوا، اس کی صدارت قطر یونیورسٹی کے شیخ یوسف عبد اللہ القرضاوی نے کی، ان کے پہلو میں مولانا ابو الحسن علی ندوی اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے تو ظاہر ہو رہا تھا کہ علم کے آسمان پر سے برج عطارد نیچے آ گیا ہے اور دوسرے سیارے اس کے ارد گرد جمع ہیں، مولانا محمد رابع ندوی کو کارروائی کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی جس کو انھوں نے پوری خوش سلیقگی اور مہارت سے انجام دیا۔

جلسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک انڈونیشی طالب علم فہمی زمزم کی پر اثر تلاوت کلام پاک سے شروع ہوا، پھر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ان بیرونی اور ملکی مندوبین کے نام پڑھ کر سنائے جو اس وقت جلسہ میں موجود تھے، اس کے بعد ابو ظبی کے چیف جسٹس شیخ احمد بن عبد العزیز المبارک کا پیام مولانا تقی الدین ندوی نے پڑھ کر سنایا، پھر مراکش یونیورسٹی کے عربک اسٹڈیز کے ڈین کا پیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مولوی سلمان ندوی نے پڑھا، آخر میں دکتور معروف الدوالیبی سابق وزیر اعظم شام و مشیر شاہ خالد سعودی عرب کے ایک خط کا متن مولانا سعید الاعظمی نے پڑھا اور اس کا اردو ترجمہ

مولانا عبد الرحمن پرواز نے سنایا۔

پھر یہ خاکسار اسٹیج پر مہمانوں کا اپنی ایک تحریر کے ذریعہ سے خیر مقدم کرنے کے لیے حاضر ہوا، علامہ شبلی نعمانیؒ اور ان کے جانشین استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مستشرقین کو سمجھنے کے لیے جو اہم اور بنیادی باتیں اپنی زندگی میں بتائی تھیں ان کی طرف اس تحریر میں خاص طور پر توجہ دلائی گئی، اس لیے اس کا پورا متن یہاں درج کرنا مناسب ہوگا:

"صدر محترم!

دارالمصنفین کی طرف سے اس مذاکرہ کے لیے اپنے عزیز مہمانوں کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتا ہوں، ارباب علم و دانش کے اس شاندار اجتماع کو دیکھ کر جہاں ہمیں فخر ہو رہا ہے وہاں ہمارے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر اور ایک مدت کی آرزو آج پوری ہو رہی ہے، جن مقاصد کے تحت دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا ان میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دین اسلام، سیرۃ نبویؐ اور اسلامی علوم و فنون کے متعلق جو تحقیقات ہوتی رہتی ہیں اس کا جائزہ لیا جاتا رہے، جہاں اور جو کام اچھا دکھائی دے اس کی داد دی جائے اور جہاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کوئی غلطی نظر آئے اس کی نشاندہی خالص علمی اور تحقیقی رنگ میں کی جائے۔

جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے ان سے متعلق ہمارے اس ادارہ کے بانی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے لیے رہنما اصول بتا گئے ہیں، اس موقع پر مختصر طریقے سے ان کے خیالات دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

یہ مستشرقین تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں،

(۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور نامکمل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے

قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔

"(۲) بعض مستشرقین عربی زبان، علم و ادب، تاریخ اور فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، وہ سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھتے، لیکن ضمنی طور پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارعِ اسلامؐ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمنی کے مشہور فاضل ساخو نے طبقات ابن سعد شائع کی تو اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن جب وہ اسلامی امور کے متعلق باتیں لکھتا ہے تو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے یا کوئی اور۔ نولدیکی نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا میں قرآن پر جو اس کا آرٹیکل ہے، جابجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے رازِ نہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

"(۳) وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر یا مارگولیتھ سے ہم کچھ امید کر سکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرتِ مطالعہ اور تفحصِ کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ خواہ دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

"مارگولیتھ نے مسند امام حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، لیکن اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب، افترا، تاویل اور تعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کر سکتی، اس کا کمال یہ ہے کہ جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

"یوروپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کو معذور سمجھ سکتے ہیں، سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا

تمام سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحٰق، تاریخ طبری وغیرہ ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، آنحضرتؐ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایاتِ صحیح منقول ہیں، یوروپین مصنفین اس سرمایہ سے زیادہ تر بے خبر ہیں، اور ایک آدھ کوئی ہے تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں، اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادات اور اسلام کے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے، جو گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کر لی جائے گی۔"

یہ وہ حقایق ہیں جو ہمارے ادارہ کے بانی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ہم کو بتا گئے ہیں، ان ہی کے شاگرد رشید اور جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے پیچھے یہ وصایا چھوڑ گئے ہیں۔

یورپ کے اہل علم نے جہاں علوم جدیدہ کا سرمایہ فراہم کیا اور اپنے لٹریچر کو نئے نئے اسلوب میں شایع کیا، وہاں علوم اسلامیہ کی اہمیت نے بھی ان کے علمی شغف کو اپنی طرف مائل کیا اور مستشرقین کے نام سے ایک مستقل گروہ نے عربی علوم و ادب کی حفاظت و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا، ان کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ علوم ان کے نہ تھے، اس لیے وہ ہمدردی اور محبت، جو مسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہو سکتی ہے، ان کو نہیں ہے، اس لیے ان کی تحقیق و تدقیق سے جہاں فائدہ ہو رہا ہے، سخت نقصان بھی پہنچ رہا ہے جس کی تلافی آج مسلمان اہل علم کا فرض ہے، ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اپنے مسیحی اور مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی علوم

نظر ڈال کر تحقیق و ریسرچ کے نام سے ایک نیا محاذ جنگ بنا کر اسلام، داعیِ اسلامؐ، اسلامی علوم، اور اسلامی تہذیب و تمدن پر بے پناہ حملے کر رہا ہے، قرآن مجید، حدیث، تصوف، سیر، رجال، کلام اور فقہ سب ان کی زد میں ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ یورپ کے اس رنگ کے لٹریچر سے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہونچا ہو اور پہونچے گا، اگر یہ زہر اسی طرح پھیلتا رہا اور اس کا تریاق نہیں تیار کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک نوجوان مسلمانوں کے دماغوں میں سمیت سرایت کر جائے گی۔"

دار المصنفین کے بانی اور ان کے جانشین ہم کو جو پیام دے گئے ہیں ہم اسی پر عمل کرتے رہے ہیں، آج کا یہ علمی مذاکرہ اسی سلسلہ کی ایک زریں کڑی ہے، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ان دونوں بزرگوں کی روحیں اس اجتماع سے خوش ہو رہی ہوں گی، وہ اور بھی خوش ہوں گی جب اس مذاکرہ میں مستشرقین کے زہر کا تریاق پورے طور پر پیش کیا جائے گا، جس سے امید ہے کہ پوری اسلامی دنیا بھی آگے چل کر مستفید ہوگی۔

آخر میں ہم ایک بار پھر اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا شکریہ صمیم قلب سے ادا کرتے ہیں کہ اس دور افتادہ قصبہ میں آنے کی زحمت گوارا کر کے انھوں نے ہمارے ادارہ کو نوازا۔"

اس کے بعد مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اپنا استقبالیہ خطبہ زبانی دیا، وہ بول رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت طلاقت لسانی کا رس گھول رہی ہے، بلاغت چاندی کے سکوں کو کھنکھنا رہی ہے، شیرینی قلاقند کی مٹھاس سے کام و دہن کو لذت آشنا کر رہی ہے، یہ خطبہ عربی زبان میں تھا، لیکن اس کی ساری باتیں اردو میں کہی جا رہی تھیں، یہ تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا، اس کا پورا متن تو آئندہ شائع ہوگا، لیکن مستشرقین سے متعلق جو باتیں کہی گئیں، وہ اس وقت ہدیۂ ناظرین ہیں، فرمایا:

"اس بات کا اعتراف ہے کہ مستشرقین میں ایک بڑی اور خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے بڑا مفید کام انجام دیا اور جہاں تک ہمارا اندازہ ہے انھوں نے اپنے علمی شغف، علم کی پیاس اور علم کی قدر و قیمت کے احساس کے تحت انجام دیا اور ان کی وجہ سے ہمارے اسلاف کی بعض ایسی

نادر کتابیں ہمارے سامنے آئیں کہ جن کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں حدیث، تفسیر، علوم عربیہ، سیرت اور تاریخ کا درس دینے والے یہ حسرت لے کر اپنے ساتھ دنیا سے چلے گئے کہ انھوں نے طبقات ابن سعد یا فلاں کتاب نہیں دیکھی تھی، تو ہمیں مستشرقین کے اس احسان کو ماننا چاہیے، اور یہی نہیں اگر خالص مستشرقین کا کوئی اجتماع ہوتا تو میں ایک مسلمان طالب علم، شمع علم کے ایک پروانہ اور چمن علم کے ایک ادنیٰ خوشہ چیں کی حیثیت سے اسی جرأت، اسی وضاحت، بلکہ اسی خود اعتمادی کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا جیسا میں اپنے عزیز بھائیوں اور مہمانوں کے سامنے اس وقت کر رہا ہوں، لیکن اسی کے ساتھ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے قرآن، حدیث، سیرت، تمدن اسلام، اسلامی معاشرہ اور پھر اسلامی حکومتوں کی تاریخ کا مطالعہ ایک خاص مقصد کے ماتحت کیا، ان کی خوردبین نگاہ وہ چیزیں تلاش کرتی رہی جن کو جمع کر دینے سے وہ قرآن، شریعت اسلامی، سیرت نبویؐ، قانون اسلامی، تمدن اسلامی اور سیاست اسلامی کی ایک ایسی تصویر پیش کر سکیں جس کو دیکھ کر لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ لیں اور ان کو اس سے گھن آئے، یہاں بڑے بڑے فضلاء موجود ہیں، ہماری بہت سی یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ کے صدر اور ذمہ دار موجود ہیں، وہ جانتے ہیں کہ تاریخ و ادب میں اس بات کی کتنی صلاحیت ہے کہ آپ اس سے جو کام لینا چاہیں، لے سکتے ہیں، دنیا کے بہت کم علوم ہیں جن میں اس کی صلاحیت ہے، یہ مواد خام ہے، آپ اگر اس سے شاہی محل تعمیر کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں، آپ اگر اس سے غریب کا جھونپڑا بنانا چاہتے ہیں تو بنا سکتے ہیں آپ اگر اس سے شاطرانہ سازش کا مرکز بنانا چاہتے ہیں تو بنا سکتے ہیں، اور اگر بے ادبی نہ ہو تو اگر آپ اس سے کسی نجاست کی جگہ بنانا چاہتے ہوں تو آپ کو اس میں یہ سامان بھی مل جائے گا، یہ آپ کی نیت پر موقوف ہے اور آپ کی محنت پر بھی اور آپ کے سلیقہ و ذہانت پر بھی اور ظاہر ہے کہ اس سلیقہ اور ذہانت کے بہت سے اسباب ہیں، جن میں کچھ طبعی، کچھ تاریخی، کچھ مذہبی، کچھ اخلاقی ہیں، کچھ کا تعلق یورپ کی

ریاست وکلیسا کی آویزش اور پھر آخر میں جنگ صلیبی سے ہے، اس کو تخریبی اور سلبی ذہانت کہنا زیادہ بہتر ہوگا، یہ سلبی ذہانت ہمارے مستشرق فضلاء میں بدرجۂ تمام پائی جاتی ہے، انھوں نے اپنی آنکھوں پہ خوردبین لگاکر تاریخ اسلام اور تمدن اسلامی اور پھر آگے بڑھ کر خاکم بدہن قرآن مجید اور سیرت نبویؐ میں وہ ذرے اور ریزے تلاش کرنے شروع کیے کہ جن سے کوئی . . . جماعت اور کوئی شخصیت خالی نہیں ہوسکتی، ان کو جمع کرکے انھوں نے ایک ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہا کہ جو ایک نہایت تاریک تصور ہی نہیں بلکہ تاریک تاثر اور تاریک جذبہ پیش کرے، ان کی مثال بالکل سینٹری انسپکٹر کی سی ہے، سینٹری انسپکٹر کسی گلزار سے گلزار شہر میں، خواہ اسلامی عہد کا قرطبہ ہو، غرناطہ ہو، بغداد ہو، دمشق ہو، یا پھر دلی ہو، احمد آباد ہو، مغلوں کے زمانہ کا لکھنؤ ہو، یا پھر اس وقت کا لندن اور نیویارک ہو، سینٹری انسپکٹر کا کام یہ ہے کہ وہ ان جگہوں کو دیکھے، خاص طور پر جہاں پانی مر رہا ہے، جہاں سڑاند پھیل رہی ہے، جہاں نالیوں کا انتظام صحیح طور پر نہیں ہے، جہاں دلدلیں ہوگئی ہیں اور پھر وہ رپورٹ پیش کرتا ہے اور اس رپورٹ میں اس کی بے انصافی یا بدنیتی کو دخل نہیں ہوتا، اس کے فرض منصبی کا تقاضا ہے کہ جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے اس کا فطری تقاضا ہے کہ وہ اپنی رپورٹ میں صرف ان گندی نالیوں، سنڈاسوں اور دلدلوں کا ذکر کرے جو اس گلزار شہر میں بمجبوری پائے جاتے ہیں، اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اس شہر میں کتنے خوشنما پارک، کیسے کیسے لہلہاتے باغ، کیسی کیسی چمن کی کیاریاں ہیں، کیسے کیسے کھلتے ہوئے پھول ہیں اور وہاں پر کیا قدرتی حسن پایا جاتا ہے، وہاں کیسے کیسے کتب خانے ہیں، اگر کوئی سینٹری انسپکٹر اس قسم کی رپورٹ دے تو شاید ہمیشہ کے لیے اس کو چھٹی دے دی جائے، حالانکہ یہ کوئی بری بات نہیں، اگر وہ کتب خانوں اور باغات کا ذکر کردے، لیکن اس کو پہائی اصطلاح میں فضولی ایک دم فضولی سمجھا جائے گا، یہ اس کے فرض میں داخل نہیں، افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بہت سے مستشرقین نے سینٹری انسپکٹر کا فرض انجام دینا طے کرلیا ہے،

انھوں نے خوردبین ہی سے نہیں بلکہ اپنی قوت شامہ کو بھی صرف تعفن کا ادراک کرنے کے لیے استعمال کیا، تاریخ اسلامی اور بعثت نبویؐ سے لے کر زوال خلافت عثمانیہ اور اس کے بعد تک کا مطالعہ سینٹری انسپکٹر کی حیثیت ہی سے کیا اور انھوں نے صرف گندگی کی رپورٹ پیش کی، ہمیں اپنے مستشرق بھائیوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ ہمارے شریک سفر ہیں، ہم اور وہ دونوں بادیۂ علم کے رہ نورد ہیں اور ہمارا ان سے ایک رشتہ ہے، کاش میری یہ آواز جو یہاں آپ تک گونج کر رہ جائے گی ان تک پہونچ سکتی تو میں ان سے کہتا کہ خدا نے آپ کو وہ صلاحیتیں عنایت فرمائی تھیں کہ اگر آپ ان سے اچھا کام لیتے، حسن بیں اور عیب چیں دونوں آنکھوں کو کھلا رکھتے، اپنی قوت شامہ کو آزاد چھوڑ دیتے اس کو اس کا پابند نہ کرتے کہ آپ صرف تعفن کو سونگھیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو حاسۂ جمال اور ذوق جمال عطا فرمایا تھا اس کو آپ مسیحیت یا پاپائیت کی تاریخ اور سائنس کی ترقی اور جنگ صلیبی کی داستان لکھنے کیلیے ہی مخصوص نہ کردیتے تو آپ یہاں سب کچھ پاسکتے تھے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

یہاں تو کلیوں کو دیکھا ہی نہیں گیا، یہاں تو صرف کانٹوں کو تلاش کیا گیا اور میں دعویٰ نہیں کرتا، علم کا تقاضا ہے کہ کوئی کلیہ کے طور پر کسی بات کا دعویٰ نہ کرے، لیکن یہ کہنا صحیح ہے کہ مستشرقین کی ایک بیشتر تعداد نے اور کم سے کم اس تعداد نے جو ہمارے سامنے ہے اور عالم اسلام کے سامنے جس کا تعارف ہوا، اپنی خوردبین سے تاریخ اسلام، حدیث اور علوم اسلامیہ، تمدن اسلامی اور اسلامی حکومتوں میں صرف عیب ہی عیب دیکھا، اسلام میں جمال بھی ہے، کمال بھی ہے اور نوال بھی ہے، مستشرقین نے تینوں چیزوں کو نظرانداز کرکے صرف معائب، صرف کمزور پہلو پیش کیے۔ میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا اور نہ آپ اس کے لیے تیار ہوں گے، لیکن مستشرقین حضرات میں کئی بڑے نام ابھی علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اقتباس میں آچکے ہیں، اور میرے خطبہ میں

اس کا پورا جائزہ لیا گیا ہے۔ استشراق اور مستشرقین پر ایک عام نگاہ ڈالی گئی ہے، تمام مغربی ممالک میں ان کے رویہ ان کے ایٹی چوڈ کو بیان کیا گیا ہے، ان کی جو چیزیں ہمارے سامنے آئی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان طالب علم اپنے اصل سرچشموں سے واقف نہیں ہے اور اس کو خدا کی رہنمائی، تائید الٰہی اور توفیق الٰہی شامل نہیں ہے تو وہ ان مستشرقین کی کتابوں کو پڑھ کر صرف ایک خیال قائم کرے گا، جیسا کہ علامہ شبلیؒ نے کہیں لکھا ہے کہ اسلام قصائیوں کی ایک دوکان ہے، جس میں ہر وقت چھریاں چلا کرتی ہیں، یا ایک میدان جنگ ہے، جس میں انسانوں کو شکار کیا جاتا ہے، یا ایک عشرت گاہ ہے، جس میں صرف حرم سرا نظر آتی ہے، حرم کے لفظ کو مستشرقین نے بڑی اہمیت دی ہے اور اس کا خوب ڈھنڈورا پیٹا ہے، میرے فاضل اور محقق دوست علامہ بہجت البیطار نے کہا کہ جب میں امریکہ گیا تو ہر پڑھا لکھا امریکن ..... دو باتیں پوچھتا تھا، تمھارے حرم سرا میں بیویاں کتنی ہیں اور تمھارے گھر میں اونٹ کتنے پلے ہیں؟ گویا مسلمان کا تخیل یہ ہے کہ اس کی متعدد منکوحات کا ایک حرم سرا ہونا ضروری ہے، اور دوسری بات یہ کہ اونٹ نہایت مقدس جانور ہے، قرآن شریف میں اس کا بار بار نام آیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس پر سفر کیے ہیں، اور مکہ سے مدینہ اسی پر ہجرت ہوئی ہے اس لیے اونٹ پالنا ایک مقدس کام ہے، اس لیے ہر مسلمان جس طرح حج کرتا ہے اور تسبیح پڑھتا ہے، اسی طرح وہ اونٹ بھی پالتا ہے، آپ خیال فرمایئے کہ ان مستشرقین نے کیا معلومات دیں، یہ اپنے کو حقیقت پسند اور صداقت کا جویا کہتے ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی زندگی کا کیا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

تذکرہ مجمع الشعرای جہانگیر شاہی تالیف ملا قاطعی ہروی، تصحیح تعلیق و مقدمہ از ڈاکٹر محمد سلیم اختر سائز ۲۲×۱۷، صفحات ۶۰۴، طباعت ٹائپ، قیمت ۱۰۰ روپیے پاکستانی ناشر انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی یونیورسٹی، کراچی،

ملا قاطعی ہروی (م ۱۰۲۴ھ) عہد مغلیہ کا صاحب کمال شخص تھا، وہ تین مغل فرمانرواؤں ہمایوں، اکبر اور جہانگیر کے درباروں سے متوسل تھا، تذکرہ مجمع الشعراے جہانگیر شاہی اسکی اہم علمی یادگار ہے، مگر یہ اس کی دوسری علمی یادگاروں کی طرح ابھی تک دسترس سے باہر تھی، اتفاق سے فیڈرل آسٹریلیا یونیورسٹی کینبرا کے ایشین اسٹڈیز کے شعبہ سے منسلک ڈاکٹر محمد سلیم اختر کو اپنے تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں اس کا سراغ لگا تو انھوں نے نقوش لاہور میں اس پر ایک تعارفی مقالہ سپرد قلم کیا، اس سے قدردانوں کا اشتیاق بڑھا تو کراچی یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز نے ان کے تعاون سے یہ تذکرہ شائع کیا ہے، جو متن کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے مقدمہ تعلیقات اور حواشی پر بھی مشتمل ہے، یہ کتاب تین دفتروں پر مشتمل تھی، مگر پہلے دو دفتر امتداد زمانہ سے محفوظ نہیں رہ گئے، ڈاکٹر محمد سلیم کو آخری اور تیسرا دفتر آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتبخانہ سر ولیم اوزلی کے ذخیرۂ مخطوطات میں دستیاب ہوا، زیر نظر کتاب میں اسی حصہ کا متن درج ہے، اس میں ۱۵۱ شعرا کا تذکرہ ہے، پہلا تذکرہ جہانگیر کا اور آخری خود مصنف کا ہے، گو قاطعی نے قدیم تذکرہ نگاروں کی طرح شعرا کے مختصر حالات، فضل و کمال اور نمونہ کلام دینے پر اکتفا کیا ہے، مگر اس سے بھی تحقیق کرنے والوں کے لیے راہ ہموار ہوگی، مقدمہ میں ایران اور پاکستان کے علمی روابط، قاطعی کے دور کے علمی حالات، اس کی تذکرہ نگاری کے انداز، تذکرہ کی نوعیت، اس کے مشمولات اور ضروری خصوصیات کا ذکر بھی ہے اور اس کی بعض

فروگذاشتوں اور ترتیب کی خامی وغیرہ کی نشاندہی بھی ہے، فاضل مستشرق اسٹوری کو اس کے بارہ میں نام سے دھوکہ ہوا، ان کے خیال میں یہ صرف جہانگیر کی مدح کرنے والے شعراء کا تذکرہ ہے، لیکن لائق مقدمہ نگار نے اسکی اس طرح تردید کی ہے کہ یہ نام عہدِ جہانگیری میں مرتب کئے جانے کی وجہ سے رکھا گیا ہے، ورنہ اس میں جہانگیری دور سے قبل کے شعراء کا بھی ذکر ہے، آخر میں قاطعی کے حالات، شاعری کا انتخاب، اس پر مختصر تبصرہ اور بعض شہروں کے ان اہلِ کمال کا ذکر ہے جن سے وہ ملا یا مستفید ہوا تھا لیکن یہ حصہ اس وجہ سے مختصر ہے کہ قاطعی کے حالات نہیں ملے، متن کے بعد تعلیقات درج ہیں، ان میں اس کے مجمل، ناکافی اور وضاحت طلب امور کی وضاحت اور ان مراجع کی نشاندہی کی ہے جن میں مزید معلومات تحریر ہیں، حواشی میں دوسری کتابوں کی مراجعت کرکے متن کی تصحیح اور فرق و اختلاف کی صراحت کی ہے، پھر کئی فہرستیں، مستدرکات و اضافات اور اغلاط کا صحت نامہ دیا گیا ہے اور آخر میں مقدمہ کا مختصر خلاصہ انگریزی میں بھی تحریر ہے، مقدمہ و تعلیقات سے مصنف کی محنت و جستجو کے علاوہ فارسی زبان و تحریر پر اچھی قدرت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، اس کتاب کی دریافت و اشاعت پر مرتب اور ناشر دونوں اہلِ علم کے شکریے کے مستحق ہیں،

تفسیر بسم اللہ و سورہ فاتحہ — از مولانا حمید الدین فراہیؒ مترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی، تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۸۰ قیمت دو روپے پچاس پیسے، پتہ - دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ (یوپی)

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے زیر نظر رسالہ کا شگفتہ اردو ترجمہ عرصہ ہوا ان کے لائق شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی نے کیا تھا، اب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے، آیت بسم اللہ کی تفسیر میں سورہ فاتحہ اور دوسری سورتوں سے اس کا تعلق دکھانے کے بعد اس کے عظمت، برکت اور رشد پر مشتمل ہونے کی یہ وضاحت کی ہے کہ وہ آغاز قرآن کے لیے موزوں ترین کلام ہے، جو اللہ کی یاد کے دین کی بنیاد ہونے اور تمام فضل و احسان اور عمل قرآن مجید کے خدا کی جانب سے ہونے کا ثبوت بھی ہے، رحمان و رحیم اور اللہ کے الفاظ کی وضاحت میں یہود

و نصاریٰ کی بعض بے اعتدالیوں کا ذکر ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر دو فصلوں میں کی ہے، پہلی فصل میں اس کے تین رخ بیان ہوئے ہیں (۱) قرآن کے سہ گانہ علوم کی جامع اور تکمیلِ نماز کی سورہ ہے (۲) نظم قرآن کا نمونہ ہے، اس کے اندر قرآن کا پورا عالم جھلک رہا ہے، (۳) سورۂ فاتحہ کا سارے قرآن پر مقدم ہونا نماز کے تمام احکام دین میں سبقت ہونے کی دلیل ہے، دوسری فصل میں مسلمانوں کی فاتحہ اور نصاریٰ کی فاتحہ کا مقابلہ کر کے دونوں کی مطابقت اور قرآن کے اسلوب کی برتری دکھائی ہے، مولانا کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ بھی حقائق، معارف، نکات اور دقیق علمی و فکری استنباطات سے معمور اور ان کی قرآن میں غواصی کا ثبوت ہے، اس لیے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

(۱) حقوق و معاملات (۲) نماز کیسے احکام و مسائل (۳) احوال قیامت — مرتبہ جناب مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈا نگری کاغذ کتابت و طباعت بہتر تقطیع متوسط و خورد صفحات بالترتیب ۲۶۴، ۱۸۲، ۷۲، قیمت بالترتیب دس، تین روپے ۳۰ پیسے، ایک روپیہ ۲۵ پیسے اول الذکر دونوں کتابیں مصنف پوسٹ مقام ڈھنی بازار، ضلع بستی سے اور تیسری تبلیغی کمیٹی شاہ گنج، محمد پور، پٹنہ سے ملیگی۔

مولانا عبد الرؤف رحمانی ایک ممتاز عالم دین ہیں، دین اور علم دین کی ترویج و اشاعت ان کا مشغلہ ہے، مدرسہ سراج العلوم عرصہ سے انکے زیر نگرانی دینی و تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، وہ مختلف رسالوں اور اخباروں میں دینی و تبلیغی قسم کے مضامین بھی برابر لکھتے رہتے ہیں اور ان کی کئی مفید کتابیں بھی چھپ گئی ہیں، یہ تینوں کتابیں اسی سلسلہ کی کڑی ہیں، پہلی کتاب میں حقوق و معاملات پر مفید بحث اور دین میں اخلاق حسنہ اور معاملات میں صفائی کی اہمیت و ضرورت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ میں شریعت کی ہدایات، رسول اکرمؐ، صحابہ کرامؓ اور ائمہ دین کے معمولات کا ذکر بھی ہے، نیز قرابتداروں، یتیموں، مہمانوں، علماء، عادل سلاطین، غلاموں، غیر مسلموں، جانوروں، پڑوسیوں، والدین، اولاد اور زوجین کے حقوق پر مستقل عنوانات کے تحت علیحدہ گفتگو کی گئی ہے، لائق مصنف نے جہاں قرآن و احادیث کے احکام، صحابہ و تابعین کے آثار، ائمہ دین کے زریں اقوال نقل کیے ہیں وہاں مختلف موثر واقعات بھی تحریر کیے ہیں جن سے حقوق و معاملات کی دینی اہمیت کے علاوہ پڑھنے والے کو انہیں ادا کرنے کا شوق و داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے، غالباً اسی بنا پر بعض روایات و واقعات کے انتخاب میں

تساہل سے کام لیا گیا ہے مثلاً ص ۳۰ پر حدیث طیر درج ہو گئی ہے جو ایک موضوع روایت ہے ص ۱۰۴ کے بعد آٹھ صفحے شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اور ص ۲۰۰ کے بعد کے آٹھ صفحے مکرر شامل ہو گئے ہیں، دوسری کتاب میں نماز اور اسکے متعلقات وضو، اذان، جماعت، امامت اور مسجد کے مسائل و احکام درج ہیں، اس میں پنجوقتہ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل تراویح وتر جمعہ، عیدین، جنازہ، استسقاء، مریض اور مسافر کی نمازوں کا بیان بھی ہے، نماز کے ضروری آداب و ارکان اعتدال خشوع و خضوع کے علاوہ فرض نمازوں اور جماعت ترک کرنے والے کے احکام لکھے ہیں اور صحابہ و تابعین محدثین اور ائمہ کے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے اور نوافل کا اہتمام کرنے کا حال بھی دیا ہے، اس مختصر رسالہ سے نماز اور اسکے سلسلہ کے اکثر اہم اور ضروری مسائل معلوم ہو جاتے ہیں مگر جن نمازوں کو پڑھنے کا کم اتفاق ہوتا ہے اگر انکی دعائیں اور طریقے واضح انداز میں لکھ دیے گئے ہوتے تو اسکا فائدہ اور بڑھ جاتا، ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کو مانتی ہے، اگر مختلف فیہ مسائل میں انکے مسلک کا ذکر بھی آجاتا تو بہتر ہوتا، تیسری کتاب میں قیامت کے احوال نظام عالم کے تہ و بالا ہونے حشر و نشر جنت و دوزخ اور اہل جنت و اہل جہنم کے انجام اور قیامت کی ہولناکی وغیرہ کا ذکر ہے، یہ تینوں رسالے عام فہم انداز اور دلنشین پیرایہ میں لکھے گئے ہیں، عام مسلمانوں کیلئے انکا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ،

نام مقام اشاعت :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت :-	ماہانہ
نام پرنٹر :-	اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قومیت	ہندوستانی
نام و پتہ مالک رسالہ	دار المصنفین اعظم گڈھ

میں اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ اقبال احمد

جلد ۱۲۹ ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ مطابق اپریل ۱۹۸۲ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات